چاند پکھراج کا
گلزار
ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

# چاند پکھراج کا

(شاعری)

گلزار

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

# چاند پُکھراج کا

ذِکر جہلم کا ہے، بات ہے دِینے کی
چاند پُکھراج کا، رات پشمینے کی

بابا ـــــ احمد ندیم قاسمی

کے نام

جنھیں میں اپنے وطن کی طرح پہچانتا ہوں

منصورہ احمد

کے نام

جن سے مجھے اپنے شعر کی پہچان ملی

# فہرست

# دیباچہ

شعری روایت سے وابستگی شاعر کے انفرادی اسلوب کی صورت پذیری میں مزاحم نہیں ہو سکتی۔ ثبوت کے طور پر گلزارؔ کی شاعری پیش کی جا سکتی ہے۔ یہ شاعری روایت سے کہیں بھی دست کش نہیں ہوئی مگر اس کے موضوعات، اس کی لفظیات اور اس کے لہجے میں جو انفرادیت ہے، وہ گلزار کے صاحبِ اسلوب شاعر ہونے پر ناقابل تردید دلالت کرتی ہے۔ یہ دیکھ کر مسرت بخش حیرت ہوتی ہے کہ سیلولائڈ کی چمک دمک سے ادھر، گلزارؔ کتنی لگن کے ساتھ مشقِ سخن میں مصروف رہا ہے۔ فلموں کی ہدایت کاری اور کہانی نویسی اور گیت نگاری کی مصروفیات میں اگر گلزارؔ اعلیٰ پائے کی شاعری کے لئے وقت نکالتا رہا تو یہ اُس کے تخلیقی وفور کا کرشمہ ہے۔ اسی وفور نے اُس سے ایسی ایسی نظم اور غزل اور تروینی کہلوائی ہے کہ دورِ حاضر میں اس انداز کی نظم، ان تیوروں کی غزل اور نوکیلی اور چوٹیلی تروینی کی کوئی مثال مشکل ہی سے دستیاب ہوگی۔

جس تخلیقی وفور کا میں نے ذکر کیا ہے، اس کے ثبوت میں اس مجموعے میں شامل ایسی نظمیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں جن کا موضوع ہی نظم کی تخلیق کا کرب ہے۔ گلزارؔ اس کرب کے اظہار میں بھی فن کار کے منصب کو نہیں بھولتا اور جب کربِ تخلیق کا ذکر کرتا ہے تو

صرف یہ کہہ کر الگ نہیں ہو جاتا کہ اظہار میں مشکل پیش آ رہی ہے بلکہ وہ کہتا ہے:

لفظ کاغذ پہ بیٹھتے ہی نہیں
اُڑتے پھرتے ہیں تتلیوں کی طرح

اسی نوعیت کی ایک نظم میں گلزارؔ نے شاعر کو ریشم کے کیڑے سے بلیغ تشبیہ دی ہے، جو لمحے لمحے کو کھولتا اور پتے پتے کو بینتا ہے، اور اپنی اک اک سانس کی لَے سن کر اسے اپنے تن پر لپیٹتا جاتا ہے۔ پھر اس وفور کے اظہار میں جو رُکاوٹیں ہیں اُن میں سے ایک کی طرف یوں اِشارہ کرتا ہے:

ایک بے چاری نظم کے پیچھے
مسئلے لاکھ روزمرہ کے

اس صورت حال میں اگر گلزارؔ نے ''چاند پکھراج کا'' میں ہمارے لئے ۱۲۳ نظمیں، غزلیں اور تروینیاں جمع کر دی ہیں تو جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، یہ اس کے تخلیقی وفور کا کرشمہ ہے۔

گلزارؔ کے ہاں موضوعات کا تنوع دیدنی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ گلزارؔ کی شاعری میں فطرت اس کے ہمزاد کا کردار ادا کرتی ہے اور فطرت کی وسعتیں کائناتی ہیں۔ وہ دن اور رات، سورج اور چاند، دھوپ اور چاندنی، ساون اور بارش، درختوں اور پتوں، پیڑوں اور پھولوں، پہاڑوں اور بادلوں وغیرہ کو اپنی تخلیقات میں یوں بے ساختگی سے استعمال کرتا ہے جیسے ہم اور آپ اپنی آنکھوں اور کانوں اور دیگر حواس کو استعمال کرتے ہیں۔ گلزارؔ کے ہاں فطرت کے یہ مظاہر جیتے جاگتے، سانس لیتے اور انسانوں کی طرح جانداروں کا روپ دھارتے محسوس ہوتے ہیں۔ شاعر اور فطرت کے یہ مظاہر ان نظموں میں باہم آمیخت ہو کر یک جان ہو جاتے ہیں۔ فطرت باقاعدہ متکلم لگتی ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون سا جوار بھاٹا کہاں سے اُٹھا ــــــــــ سمندر سے یا

گلزؔار کے ذہن کی حساس رَگوں سے۔

فطرت اس کے ہاں استعارے کا کام بھی دیتی ہے، علامت کا بھی اور اس کے افکار کے پس منظر کا بھی۔ اسی لئے جب وہ برسات کا ذکر کرتا ہے تو صرف برسات کا ذِکر نہیں کرتا بلکہ کہتا ہے:

تمام موسم ٹپک رہا ہے
پلک پلک رس رہی ہے یہ کائنات ساری

فطرت کا یہ استعارہ اس کی شاعری کے محبوب موضوع —— محبت اور پھر محبت کے بنیادی موضوع — ہجر و وِصال کے اظہار میں اس کا خاص فنکارانہ ہتھیار ہے۔ بہت کم شاعروں کے ہاں محبت کا حِسی تجربہ اتنی بے شمار باریک اور مہین پرتوں کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

گلزؔار کی شاعری شاہد ہے کہ اس نے محض محبت نہیں کی۔ ٹوٹ کر محبت کی ہے۔ عشق اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔ چنانچہ جب وہ اس موضوع پر بولتا ہے تو جیسے عشق متشکل ہو کر بولتا ہے۔ ہجر و وصال دونوں ایک سی شدت کے ساتھ اس کے ہاں وارد ہوتے ہیں چنانچہ وہ ایک غزل میں کہتا ہے:

اپنے ماضی کی جستجو میں بہار
پیلے پتے تلاش کرتی ہے
ایک اُمید بار بار آکر
اپنے ٹکڑے تلاش کرتی ہے

اور

آپ کے بعد ہر گھڑی ہم نے
آپ کے ساتھ ہی گزاری ہے

پھر ایک نظم میں گلزار نے کہا ہے:

ترے غم کا نمک چکھ کر
بڑا میٹھا لگا ہے زِندگی کا ذائقہ مجھ کو

محبت کا یہ وہ مقام ہے جہاں فراق و وِصال شاعر کے دِل و دماغ پر اپنی گرفت کے لحاظ سے متحد نظر آنے لگتے ہیں۔ کہیں وہ محبوب سے کہتا ہے کہ تیرے قرب کی برکت سے میرے جسم سے سینکڑوں فالتو جسم اُتر گئے ہیں اور کہیں عالمِ فراق میں اسے محبوب کی کہی ہوئی باتوں کا لمس بھی سرشار کر دیتا ہے۔ کہیں وہ محبوب کی رخصت کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

جیسے جھنا کے چٹخ جائے کسی ساز کا تار
جیسے ریشم کی کسی ڈور سے انگلی کٹ جائے

یا وصل کے عالمِ سرخوشی میں وہ پکار اُٹھتا ہے:

نزدیک سے کچھ بھی تو دکھائی نہیں دیتا

محبت اور اس کی متنوع کیفیات گلزار کا محبوب موضوع ہیں مگر وہ مسائل حیات پر بھی فکر کرتا ہے اور حیران ہوتا ہے کہ موت تو سبھی پر آتی ہے مگر:

زندگی سب پہ کیوں نہیں آتی!

ان چھ الفاظ کے ایک مصرعے میں شاعر نے زندگی کی کربنا کی اور سفا کی کو سمیٹ لیا ہے۔ اسی طرح اس کی تین ''بجھارت نما'' نظمیں ہیں، جن کے موضوعات، غصہ، نشہ اور غم ہیں۔ ''بجھارت'' کے لفظ سے یہ غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے کہ ممکن ہے یہ محض دماغی کرتب ہوں مگر ان تینوں کی فکری کیفیت نہایت گہری ہے۔ یہ گہرائی کاغذ کی کشتی کے استعارے میں بھی موجود ہے جہاں یہ کھلونا اس کرب میں سے گزرتا ہے جو اسے اپنے وجود کے شعور سے حاصل ہوتا ہے، یا پھر ''ریفیوجی'' میں بھی یہی شعور ایک بچے سے اس کا بچپن چھین لیتا

پھر ایک نظم میں گلزار نے کہا ہے:

ترے غم کا نمک چکھ کر
بڑا میٹھا لگا ہے زِندگی کا ذائقہ مجھ کو

محبت کا یہ وہ مقام ہے جہاں فراق و وِصال شاعر کے دِل و دماغ پر اپنی گرفت کے لحاظ سے متحد نظر آنے لگتے ہیں۔ کہیں وہ محبوب سے کہتا ہے کہ تیرے قرب کی برکت سے میرے جسم سے سینکڑوں فالتو جسم اُتر گئے ہیں اور کہیں عالمِ فراق میں اسے محبوب کی کہی ہوئی باتوں کا لمس بھی سرشار کر دیتا ہے۔ کہیں وہ محبوب کی رخصت کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

جیسے جھنا کے چٹخ جائے کسی ساز کا تار
جیسے ریشم کی کسی ڈور سے انگلی کٹ جائے

یا وصل کے عالمِ سرخوشی میں وہ پکار اُٹھتا ہے:

نزدیک سے کچھ بھی تو دکھائی نہیں دیتا

محبت اور اس کی متنوع کیفیات گلزار کا محبوب موضوع ہیں مگر وہ مسائل حیات پر بھی فکر کرتا ہے اور حیران ہوتا ہے کہ موت تو سبھی پر آتی ہے مگر:

زندگی سب پہ کیوں نہیں آتی!

ان چھ الفاظ کے ایک مصرعے میں شاعر نے زندگی کی کربنا کی اور سفا کی کو سمیٹ لیا ہے۔ اسی طرح اس کی تین ''بجھارت نما'' نظمیں ہیں، جن کے موضوعات، غصہ، نشہ اور غم ہیں۔ ''بجھارت'' کے لفظ سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ ممکن ہے یہ محض دماغی کرتب ہوں مگر ان تینوں کی فکری کیفیت نہایت گہری ہے۔ یہ گہرائی کاغذ کی کشتی کے استعارے میں بھی موجود ہے جہاں یہ کھلونا اس کرب میں سے گزرتا ہے جو اسے اپنے وجود کے شعور سے حاصل ہوتا ہے، یا پھر ''ریفیو جی'' میں بھی یہی شعور ایک بچے سے اس کا بچپن چھین لیتا

ہے۔فکر کا یہ عنصر گلزآر کی شاعری میں ایک انڈر کرنٹ کی طرح رواں رہتا ہے۔

ظاہر ہے اس انتہا کا سوچتا ہوا ذہن اپنے آس پاس کی زندگی سے آنکھیں بند نہیں رکھ سکتا۔گلزآر حقائق کی دنیا سے بھاگتا نہیں بلکہ اس سے نمٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ روزانہ اخباروں کی لرزا دینے والی خبریں پڑھ کر وہ بتاتا ہے کہ:

سارا دن میں خون میں لت پَت رہتا ہوں

اس نے ایک نظم میں زندگی کو ٹین کے خالی ڈبے سے تشبیہ دی ہے جو تیز ہواؤں میں، دیوار و دَر سے ٹکراتا پھر رہا ہے۔اسی طرح وہ ایک جلا ہے سے بے داغ اور بے گرہ زندگی کی تکمیل کا درس لینے جاتا ہے۔ پومپیئے کے سینکڑوں برس پرانے آثار کا ذکر کرنے کے بعد وہ اس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ غربت و امارت اور ظلم و جبر کے جو نقشے پومپیئے کی کھدائی میں برآمد ہوئے ہیں وہ آج اس ترقی یافتہ، مہذب اور ماڈرن معاشرے میں بھی پوری تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔گلزآر کا عصری اور سماجی شعور اس کی محبت کی ہمہ گیری اور پھیلاؤ کے برعکس بے حد نوکیلا ہے۔اسے معاشرے کی ناہمواریاں اور ناانصافیاں شعور کی انتہائی گہرائی تک متاثر کرتی ہیں۔نظم ''ایک پتہ'' میں اس نے پسی ہوئی انسانیت کی نقشہ کشی بڑی دردمندی سے کی ہے۔ سرسری نظر ڈالنے والوں سے یہ جزئیات پوشیدہ رہ جاتی ہیں۔انھی جزئیات کے حوالے سے وہ خدا سے بھی چند سوال کرتا ہے۔گلزآر کے اس رویے میں ایک اپنائیت سے مملو بغاوت ہے جو سوال کرنے کا حوصلہ دیتی ہے اور اختلاف کرنے کی طاقت عطا کرتی ہے۔ یوں اس کے ہاں کہیں کہیں طنزیہ لہجہ بھی در آتا ہے۔ وہ جب مصور سے افلاس کی تصویری بنانے کو کہتا ہے یا اس شاعر کا ذکر کرتا ہے جسے افلاس کی سچی نقشہ کشی کے بدلے خلعتِ کم خواب ملتی ہے تو یہ طنزیہ لہجہ عروج پر پہنچ جاتا ہے۔

عالمِ انسانیت کے ماضی کے آئینے میں وہ جب حال کا عکس دیکھتا ہے تو طنز کی کاٹ نہایت شدید ہو جاتی ہے۔ وہ کھنڈروں میں قدیم راتوں کی بوسیدہ قبریں، گزرے

دنوں کی شکستہ صلیبیں، شفق کی چتائیں، وقت کے ٹوٹے گرز اور ڈھیر پڑی صدیاں دیکھتا ہے اور اسے عالی شان ایوانوں کی باقیات میں سے:

ایک جھینگر کی آ رہی ہے صدا

کا المیہ دستیاب ہوتا ہے۔ کھنڈر اور میوزیم اور اپنے مکان سے گزر کر جب وہ پومپیئے پر اپنی وہ غیر فانی نظم لکھتا ہے جس کا ذکر اُوپر آ چکا ہے تو وہ ہمیں بتاتا ہے کہ:

شہر کھودا تو تواریخ کے ٹکڑے نکلے

اور وہاں اسے وقت کے پتھرائے ہوئے صفحے اور فراموش شدہ تہذیب کے پرزے اور منجمد لاوے میں اکڑے ہوئے انسانوں کے گچھے دکھائی دیتے ہیں۔ تب وہ گھبرا کر اپنے آس پاس دیکھتا ہے مگر وہاں بھی اُسے پومپیئے ہی کے مناظر نظر آتے ہیں اور وہ سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ کہیں آج کا انسان ترقیٔ معکوس میں مبتلا نہیں ہے! ایسی صورتِ حالات کے بارے میں سوچتے تو شاید بہت سے لوگ ہیں مگر اس کا انتہائی فن کارانہ اظہار گلزؔار اور اس کی قبیل کے معدودے چند شعراء ہی کے حصے میں آیا ہے۔

گلزؔار کی لفظیات دورِ حاضر کی اُردو شاعری کے برعکس قطعی طور پر منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ یہاں میں الفاظ نہیں گنواؤں گا، اظہار کے صرف چند کرشموں، چند پیکروں کا ذکر کروں گا جو گلزؔار کی نظموں اور غزلوں میں ایک کے بعد ایک وارد ہوتی چلی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوگا کہ گلزؔار اپنے جذبہ و احساس میں برش ڈبو کر ایسی تصویریں پینٹ کر رہا ہے، مثلاً:

گہنائے ہوئے چاند کی دھجی، (گہرا نشیب ظاہر کرنے کے لئے) لڑھکی ہوئی وادی، لکڑی سی بے حس پڑی رات، پیٹھ پھیرے ہوئے دروازے، بادلوں کے جزیرے، شب کا نیلا گنبد، ماضی کی خشک شاخیں، گزرے ہوئے لمحوں کے پتے، دروازے پر چراغ کی لَو کا ٹیکا، سناٹوں کی دھول، آواز میں لپٹی خاموشی، روشنی کی سفید کرچیں، آنکھوں پر دھوپ کے تیزاب کے چھینٹے، افق کی ٹہنی پر بیٹھی سنہری کونجیں، آنکھوں کے حروف، آواز کو دیکھنا،

نگاہوں کا سننا، اُٹھتی ہوئی نظروں کی گونج، شام کا زمین پر پلکوں کی طرح اُترنا، آنکھوں کی آہٹیں، چہروں کا شور، کانوں میں آواز کو مندروں کی طرح پہن لینا، صحرا میں بارش برسنے سے ریت کا سنسنا اٹھنا، وقت سے کٹ کر لمحے کا گرنا، (ہجر کے بیان میں) ''میرے بستر پہ کیسا سناٹا سو رہا ہے'' اور (وصل کے بیان میں) ''بس ایک مدھم سی روشنی میرے ہاتھوں پیروں میں بہہ رہی ہے۔'' ——— یہ محض چند مثالیں ہیں عام اور مروجہ روش سے ہٹ کر شاعری کی جدید لفظیات اور منفرد پیکروں کی ——— چنانچہ گلزآر جہاں موضوع و مواد کے معاملے میں یکتا ہے وہاں نئی نئی علامتوں کا بھی بے مثال تخلیق کار ہے۔

میں اس تفصیل کو شاعری کے ذہین قارئین کے لئے چھوڑے دیتا ہوں کہ نظم کے علاوہ غزل میں بھی گلزآر نے جدت طرازی اور معنی آفرینی کے کیسے کیسے کمالات دکھائے ہیں۔ میں غزلوں کے صرف چند منتخب اشعار پیش کرنے پر اِکتفا کرتا ہوں جو گلزآر کے خاص اپنے اسلوب کے نمائندہ ہیں:

وقت کے تیر تو سینے پہ سنبھالے ہم نے
اور جو نیل پڑے ہیں، تری گفتار سے ہیں

---

آئنہ دیکھ کر تسلی ہوئی
ہم کو اس گھر میں جانتا ہے کوئی

---

کتنی لمبی خاموشی سے گزرا ہوں
ان سے کتنا کچھ کہنے کی کوشش کی

---

آدمی خود ہی دَوڑے جاتا ہے
خود ہی چابک بدست ہے بھائی!

---

شام کے سائے بالشتوں سے ناپے ہیں
چاند نے کتنی دیر لگا دی آنے میں

---

خالی کر گھے میں عمر بنتا رہا
اب گرہ کے لئے بھی دھاگا نہیں

---

ایک پل دیکھ لوں تو اٹھتا ہوں
جل گیا گھر، ذرا سا رہتا ہے

---

میں نہ ہوں گا تو خزاں کیسے کٹے گی تیری
شوخ پتے نے کہا شاخ سے، مرجھاتے ہوئے

---

یہ سراسر نئی آواز ہے، نیا لحن ہے، نیا لہجہ ہے —— گہرے معانی سے چھلکتا ہوا، محسوسات کو متلاطم کرتا ہوا، تخلیق وفور سے بھرپور، جیتا جاگتا کھنکتا ہوا لہجہ!

احمد ندیم قاسمی

---

# عرض ہے ـــــــــ

"فلیش بیک" سنانے کی بہت عادت ہے مجھے۔ اپنی فلموں میں بہت اِفراط کے ساتھ اُن کا استعمال کرتا ہوں۔ اس مجموعے کا بھی ایک 'فلیش بیک' ہے ـــــــ ۱۹۸۸ء کی بات ہے، منصورہ احمد نے کہیں سے میرا پتہ حاصل کیا، اور کئی گز لمبا ایک خط لکھا، جس میں اُس نے تین لوگوں کا تعارف کرایا مجھ سے! باباؔ کا، جنہیں آپ احمد ندیمؔ قاسمی کے نام سے جانتے ہیں ـــــــ دوسرا اپنا، اور تیسرا میرا ـــــــ اُن سے پتہ چلا کہ میں اچھے شعر کہہ لیتا ہوں۔ کچھ عروض کی غلطیاں درست کرنا باقی ہیں۔ میں نے نہایت فرماں برداری سے کچھ نظمیں بھیج دیں، جنہیں باباؔ نے درست کیا۔ اور حوصلہ افزائی کی۔ اپنی شاعری کی پہچان کے لئے اُن کا بہت ممنون ہوں!

یہ نظمیں 'پکھراج' کے نام سے ہندی میں بھی چھپیں۔ لیکن اُن میں غزلیں شامل نہیں تھیں، اور کچھ بعد کی نظمیں! ـــــــ کچھ نظمیں اب مجھے بہت ہی پرانی لگتی ہیں۔ اس لئے اس بار وہ 'کھرچن' میں نے نکال دی ہے۔

'تروینی' ایک بار پھر شامل کر رہا ہوں۔ اور ایک بار پھر اس کی فارم بتا دُوں۔ اس لئے کہ یہ فارم میں نے خود ہی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ 'ہائیکو' بھی نہیں۔ 'مثلث' بھی نہیں۔ یہ تین مصروعوں کی نظم بھی نہیں ہے۔ اس میں پہلے دو مصرعے ایک پورا مکمل شعر ہیں۔ خیال پہلے دو مصرعوں میں مکمل ہو جاتا ہے، تیسرا مصرع روشندان کی طرح کھلتا ہے۔ اُس کی روشنی میں پہلے شعر کا تاثر بدل جاتا ہے۔ تیسرا مصرع comment بھی ہوسکتا ہے۔ اضافہ بھی! 'تروینی' میں ایک شوخی کا رنگ ہے، آر، کے لکشمن کے کارٹون 'you said it' کی طرح!۔

کچھ دوستوں کا ذکر ضروری ہے جنہوں نے کئی طرح میری مدد کی۔ ایک یہ میرے راہی صاحب ہیں جو کتاب کو ترتیب دے رہے ہیں۔ اتنا اچھا نام ہے 'سبر وآل' لوگ 'سبو' بلاتے ہیں، تو اور بھی اچھا لگتا ہے۔ تخلص 'سبو' ہی رکھ لیتے تو کیا تھا؟ اب بھی کچھ نہیں بگڑا!!!

سکھبیر، ہندی اور پنجابی کے شاعر ہیں۔ ماڈرن نظم سے میرا تعارف کرانے والے وہی ہیں۔ میں اُن سے پوچھتا نہیں، لیکن آج بھی نظم کہہ لینے کے بعد، چپ چاپ اُن کے 'approval' کا انتظار کرتا ہوں۔

سنجے شیکھر، ہیں خاموشی سے 'Silences' کے ساتھ جڑے اور اب میری تمام کتابوں کا حصہ ہیں۔

جناب آر۔ کے۔ مہرہ کا شکریہ نہ کہوں تو ناشکرا کہلاؤں مجھے خود اپنی کتابوں پر اتنا بھروسا نہیں تھا، جتنا اُنہیں تھا۔ اور کتاب کو اتنی خوبصورتی سے پیش کرنا، صرف انہی کی قابلیت ہے۔ اُن کا اِشتیاق دیکھ کر لگتا ہے، کتابوں سے شادی کی ہے! بیچاری بھابی۔

گلزار

۱۸راگست ۱۹۹۴ء

# قطرہ قطرہ

تمہارے غم کی ڈلی اُٹھا کر
زبان پہ رکھ لی ہے دیکھو میں نے
یہ قطرہ قطرہ پگھل رہی ہے
میں قطرہ قطرہ ہی جی رہا ہوں

رات کل گہری نیند میں تھی جب
ایک تازہ سفید کینوس پر
آتشیں، لال سُرخ رنگوں سے
میں نے روشن کیا تھا اک سُورج

صبح تک جل گیا تھا وہ کینوس
راکھ بکھری ہُوئی تھی کمرے میں

# لینڈ سکیپ

دُور، سُنسان سے ساحل کے قریب
ایک جواں پیڑ کے پاس
عمر کے درد لیے، وقت کا مٹیالا دُشالہ اوڑھے
بوڑھا سا پام کا ایک پیڑ، کھڑا ہے کب سے
سینکڑوں سالوں کی تنہائی کے بعد
جھک کے کہتا ہے جواں پیڑ سے۔۔۔"یار!
سرد سنّاٹا ہے!
تنہائی ہے! کُچھ بات کرو!"

# گلی میں

بارش ہوتی ہے تو پانی کو بھی لگ جاتے ہیں پاؤں
درودیوار سے ٹکرا کے گُذرتا ہے گلی سے
اور اُچھلتا ہے چھپاکوں میں
کِسی میچ میں جیتے ہوئے لڑکوں کی طرح!

جیت کر آتے ہیں جب میچ گلی کے لڑکے
جُوتے پہنے ہوئے کینوس کے اُچھلتے ہوئے گیندوں کی طرح،
درودیوار سے ٹکرا کے گُذرتے ہیں،
وہ پانی کے چھپاکوں کی طرح!!

# کھنڈر

میں کھنڈروں کی زمیں پہ کب سے بھٹک رہا ہوں
قدیم راتوں کی ٹوٹی قبروں کے میلے کتبے
دنوں کی ٹوٹی ہوئی صلیبیں گری پڑی ہیں
شفق کی ٹھنڈی چتاؤں سے راکھ اُڑ رہی ہے
جگہ جگہ گُرز وقت کے چُور ہو گئے ہیں
جگہ جگہ ڈھیر ہو گئی ہیں عظیم صدیاں

میں کھنڈروں کی زمیں پہ کب سے بھٹک رہا ہوں
یہیں مُقدّس ہتھیلیوں سے، گری ہے مہندی
دِیوں کی ٹوٹی ہوئی لویں زنگ کھا گئی ہیں

یہیں پہ ماتھوں کی روشنی جل کے بُجھ گئی ہے
سپاٹ چہروں کے خالی پنّے کُھلے ہوئے ہیں
حروف آنکھوں کے، مِٹ چکے ہیں

میں کھنڈروں کی زمیں پہ کب سے بھٹک رہا ہوں
یہیں کہیں زندگی کے معنی گِرے ہیں اور گِر کے کھو گئے ہیں

# خانہ بدوش

چار تنکے اُٹھا کے جنگل سے
ایک بالی اناج کی لے کر
چند قطرے بلکتے اشکوں کے
چند فاقے بجھے ہوئے لب پر
مٹھی بھر اپنی قبر کی مٹّی
مُٹھی بھر آرزوؤں کا گارا
ایک تعمیر کی، لیے حسرت
تیرا خانہ بدوش بے چارہ
شہر میں دربدر بھٹکتا ہے

تیرا کاندھا ملے تو سر ٹیکوں

# گرہیں

مجھ کو بھی ترکیب سکھا کوئی یار جُلا ہے!
اکثر تجھ کو دیکھا ہے کہ تانا بُنتے
جب کوئی تاگا ٹوٹ گیا یا ختم ہوا
پھر سے باندھ کے
اور سرا کوئی جوڑ کے اُس میں
آگے بُننے لگتے ہو
تیرے اس تانے میں لیکن
اک بھی گانٹھ گرہ بُنتر کی
دیکھ نہیں سکتا ہے کوئی

میں نے تو اک بار بُنا تھا ایک ہی رِشتہ
لیکن اس کی ساری گرہیں
صاف نظر آتی ہیں میرے یار جُلا ہے!

# ایک دَور

چاند کیوں اَبر کی اُس میلی سی گٹھری میں چُھپا تھا
اُس کے چھپتے ہی اندھیروں کے نکل آئے تھے ناخُن
اور جنگل سے گُزرتے ہوئے معصوم مسافر
اپنے چہروں کو کھرونچوں سے بچانے کے لیے چیخ پڑے تھے

چاند کیوں اَبر کی اُس میلی سی گٹھری میں چُھپا تھا
اس کے چھپتے ہی اُتر آئے تھے شاخوں سے لٹکتے ہوئے
آسیب تھے جتنے
اور جنگل سے گُزرتے ہوئے رَہ گیروں نے گردن میں اُترتے
ہوئے دانتوں سے سُنا تھا
پار جانا ہے تو پینے کو لہو دینا پڑے گا

چاند کیوں اَبر کی اُس میلی سی گٹھری میں چُھپا تھا
خون سے لتھڑی ہوئی رات کے رہ گیروں نے دوزانو پہ گر کر،
"روشنی، روشنی"! چلاّیا تھا، دیکھا تھا فلک کی جانب،
چاند نے گٹھری سے ایک ہاتھ نکالا تھا، دِکھایا تھا چمکتا ہوا خنجر

# دَنگے

شہر میں آدمی کوئی بھی نہیں قتل ہُوا
نام تھے لوگوں کے جو قتل ہُوئے
سر نہیں کاٹا، کسی نے بھی، کہیں پر کوئی
لوگوں نے ٹوپیاں کاٹی تھیں کہ جن میں سَر تھے

اور یہ بہتا ہُوا سُرخ لہو ہے جو سڑک پر
صرف آوازیں ذبح کرتے ہُوئے خون گِرا تھا

# اخبار

سارا دن میں خُون میں لت پت رہتا ہوں
سارے دن میں سُوکھ سُوکھ کے کالا پڑ جاتا ہے خُون
پپڑی سی جم جاتی ہے
کھرچ کھرچ کے ناخونوں سے
چمڑی چھلنے لگتی ہے
ناک میں خون کی کچّی بُو
اور کپڑوں پر کچھ کالے کالے چکتے سے رہ جاتے ہیں

روز صبح اخبار میرے گھر
خون میں لت پت آتا ہے

# وِراثت

اپنی مرضی سے تو مذہب بھی نہیں اُس نے چُنا تھا
اُس کا مذہب تھا جو ماںباپ سے، ہی اُس نے وِراثت میں لیا تھا

اپنے ماںباپ چُنے کوئی یہ ممکن ہی کہاں ہے؟
اُس پہ یہ مُلک بھی لازِم تھا کہ ماںباپ کا گھر تھا اِس میں
یہ وطن اُس کا چناؤ تو نہیں تھا ____

وہ تو کُل نو ہی برس کا تھا، اُسے کیوں چُن کر
فِرقہ وارانہ فسادات نے کل قتل کیا ____ !

# معنی

چوک سے چل کر، مَنڈی اور بازار سے ہو کر
لال گلی سے گُزری ہے کاغذ کی کشتی
بارش کے لاوارث پانی پر بیٹھی بے چاری کشتی
شہر کی آوارہ گلیوں میں سہمی سہمی گُھوم رہی ہے
پُوچھ رہی ہے
ہر کشتی کا ساحل ہوتا ہے تو کیا میرا بھی کوئی ساحل ہوگا؟

اِک معصوم سے بچّے نے
بے معنی کو معنی دے کر
رَدّی کے کاغذ پر کیسا ظلم کیا ہے

# بَھمیری

ہم سب بھاگ رہے تھے
ریفیو جی تھے
ماں نے جتنے زیور تھے، سب پہن لیے تھے
باندھ لیے تھے ___
چھوٹی مُجھ سے ___ چھ سالوں کی
دُودھ پلا کے، خُوب کھلا کے، ساتھ لیا تھا
میں نے اپنی ایک "بھمیری" اور اک "لاٹو"
پاجامے میں اُڑس لیا تھا
رات کی رات، ہم گاؤں چھوڑ کر بھاگ رہے تھے
ریفیو جی تھے ___

آگ دھوئیں اور چیخ پکار کے جنگل سے گُزرے تھے سارے
ہم سب کے سب گھور دھوئیں میں بھاگ رہے تھے
ہاتھ کسی آندھی کی آنتیں پھاڑ رہے تھے
آنکھیں اپنے جبڑے کھولے بھونک رہی تھیں
ماں نے دوڑتے دوڑتے خون کی قے کر دی تھی

جانے کب چَھوٹی کا مُجھ سے چھُوٹا ہاتھ
وہیں اُسی دن پھینک آیا تھا اپنا بچپن ___
لیکن میں نے سرحد کے سناٹوں کے صحراؤں میں اکثر دیکھا ہے
ایک "بھمیری" اب بھی ناچا کرتی ہے
اور ایک "لاٹو" اب بھی گھُوما کرتا ہے ___

# تعاقب

صبح سے شام ہوئی اور ہرن مجھ کو چھلاوے دیتا
سارے جنگل میں پریشان کیے گھوم رہا ہے اب تک
اس کی گردن کے بہت پاس سے گزرے ہیں کئی تیر مرے
وہ بھی اب اتنا ہی ہشیار ہے جتنا میں ہوں
اِک جھلک دے کے جو گم ہوتا ہے وہ پیڑوں میں
میں وہاں پہنچوں تو ٹیلے پہ، کبھی چشمے کے اُس پار نظر آتا ہے
وہ نظر رکھتا ہے مجھ پر
میں اُسے آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتا

کون دوڑائے ہوئے ہے کس کو
کون اب کس کا شکاری ہے پتہ ہی نہیں چلتا

صبح اُترا تھا میں جنگل میں
تو سوچا تھا کہ اس شوخ ہرن کو
نیزے کی نوک پہ پرچم کی طرح تان کے میں شہر میں داخل ہوں گا

دِن مگر ڈھلنے لگا ہے
دل میں اِک خوف سا اب بیٹھ رہا ہے
کہ بالآخر یہ ہرن ہی
مجھے سینگوں پر اٹھائے ہوئے اک غار میں داخل ہوگا

# دستک

صبح صبح اک خواب کی دستک پر دروازہ کھولا، دیکھا
سرحد کے اُس پار سے کچھ مہمان آئے ہیں
آنکھوں سے مانوس تھے سارے
چہرے سارے سُنے سنائے
پاؤں دھوئے، ہاتھ دُھلائے
آنگن میں آسن لگوائے
اور تنّور پہ مکّی کے کچھ موٹے موٹے روٹ پکائے
پوٹلی میں مہمان مرے
پچھلے سالوں کی فصلوں کا گُڑ لائے تھے

آنکھ کُھلی تو دیکھا گھر میں کوئی نہیں تھا
ہاتھ لگا کر دیکھا تو تنّور ابھی تک بُجھا نہیں تھا
اور ہونٹوں پر میٹھے گُڑ کا ذائقہ اب تک چپک رہا تھا

خواب تھا شاید!
خواب ہی ہوگا!!

سرحد پر کل رات، سُنا ہے، چلی تھی گولی
سرحد پر کل رات، سُنا ہے
کچھ خوابوں کا خُون ہوا تھا!

# دوست

بے یار و مددگار ہی کاٹا تھا سارا دِن
کچھ خود سے اجنبی سا، کچھ تنہا، اُداس سا
ساحل پہ دِن بُجھا کے میں لوٹ آیا پھر وہیں
سُنسان سی سڑک کے اِس خالی مکان میں

دَروازہ کھولتے ہی میز پر کتاب نے،
ہلکے سے پھڑ پھڑا کے کہا:
"دیر کر دی دوست"

# مُندرے

نیلے نیلے سے شب کے گنبد میں
تان پُورہ ملا رہا ہے کوئی!

ایک شفّاف کانچ کا دریا!
جب کھنک جاتا ہے کنارے سے
دیر تک گونجتا ہے کانوں میں
پلکیں جھپکا کے تکتی، ہیں شمعیں
اور فانوس گنگناتے ہیں

میں نے مُندروں کی طرح کانوں میں
تیری آواز پہن رکھی ہے!

# اَنجل

نیند کی چادر چیر کے باہر نکلا تھا میں،
آدھی رات اک فون بجا تھا

دُور کسی موہوم سرے سے
اک انجان آواز نے چُھو کر پوچھا تھا:
" آپ ہی وہ شاعرِ ہیں جس نے
اپنی کچھ نظمیں سوناںؔ کے نام لکھی ہیں؟

میرا نام بھی سوناںؔ ہو تو؟"
ایک پتلی سی جھِلّی جیسی خاموشی کا لمبا وقفہ
"میرے نام ایک نظم لکھو نا!

مجھ کو اپنے اک چھوٹے سے شعر میں سی دو،
اَنجلؔ لکھنا
شاید میری آخری شب ہے
آخرِی خواہش ہے، میں آپ کو سونپ کے جاؤں؟"
فون بُجھا کر
دھجّی دھجّی نیند میں پھر جا لیٹا تھا میں!

اَنجلؔ!
اس کے بہت دِنوں کے بعد مجھے معلوم ہوا تھا
درد سے درد بُجھانے کی اک کوشش میں تم،
کینسر کی اُس آگ پہ میری نظمیں چھڑکا کرتی تھیں

نیند بھری وہ رات کبھی یاد آئے تو،
اب بھی ایسا ہوتا ہے
ایک دُھواں سا آنکھوں میں بھر جاتا ہے!

# شفق

روز ساحل پر کھڑے ہو کے یہی دیکھا ہے
شام کا پگھلا ہوا سُرخ سُنہری روغن
روز مٹیالے سے پانی میں یہ گھل جاتا ہے

روز ساحل پر کھڑے ہو کے یہی سوچا ہے
میں جو پگھلی ہوئی رنگین شفق کا روغن
پونچھ لوں ہاتھوں پہ اور چپکے سے اک بار کبھی
تیرے گلنار سے رُخساروں پہ چھپ سے مل دوں

شام کا پگھلا ہوا سُرخ سُنہری روغن

# یُدھ

سُورج کے زخموں سے رِستا لال لہو
دُور اُفق سے بہتے بہتے اِس ساحل تک آ پہنچا ہے
کِرنیں مٹّی پھانک رہی ہیں
سائے اپنا پِنڈ چھُڑا کر بھاگ رہے ہیں
تھوڑی دیر میں لہرائے گا چاند کا پرچم

رات نے پھر رَن جیت لیا ہے
آج کا دن پھر ہار گیا ہوں

# بانجھ

کوئی چنگاری نہیں جلتی کہیں ٹھنڈے بدن میں میرے
سانس کے ٹوٹے ہوئے تاگے لٹکتے ہیں گلے سے
بُلبُلے پانی کے اٹکے ہوئے، برفاب لہو میں
نیند پتھرائی ہوئی آنکھوں پہ بس رکھی ہوئی ہے
رات بے حس ہے، مرے پہلو میں لکڑی سی پڑی ہے

کوئی چنگاری نہیں جلتی کہیں ٹھنڈے بدن میں میرے
بانجھ ہوگی وہ کوئی جس نے مجھے جنم دیا

# مکان

ایک لُڑھکی ہوئی وادی میں،
بہت نیچے خلاؤں سے،
جہاں دُھندلی فضاؤں کا چلن ہے
خستہ سا ایک مکاں مجھ کو وراثت میں مِلا ہے

جس طرح سُوکھ کے زخموں سے گرا کرتی ہے پپڑی
اس کی دیواروں سے اس طرح سے گرتا ہے پلستر
ایک پاؤں پہ کھڑے سارے ستوں تھک سے گئے ہیں
خُوردہ دانتوں کی طرح ہلتی ہیں ہر طاق میں اینٹیں
موچ کھائی ہوئی کچھ کھڑکیاں ترچھی سی کھڑی ہیں
کانچ دُھندلائے ہوئے، چٹخے ہوئے،
پہلے باہر کی طرف کُھلتی تھیں، اَفلاک کی جانب

اب یہ اندر بھی نہیں کھلتیں، اگر سانس گھٹے
ابر آلود ہیں اب،
اور ہواؤں میں بھی سوراخ پڑے ہیں

میرا پیدائشی گھر ہے، مجھے رہنا ہے یہیں پر
ایک میلا سا فلک ہے تو مرے سر پہ ابھی تک
ڈرتا ہوں، گر نہ پڑے سوتے میں ایک روز کہیں

# 'میں'

میں کائنات میں، سیّاروں میں، بھٹکتا تھا
دُھوئیں میں، دُھول میں اُلجھی ہُوئی کرن کی طرح
میں اِس زمیں پہ بھٹکتا رہا ہوں صدیوں تک
گِرا ہے وقت سے کٹ کے جو لمحہ، اُس کی طرح

وطن ملا تو گلی کے لیے بھٹکتا رہا
گلی میں گھر کا نِشاں ڈھونڈتا رہا برسوں
تمہاری رُوح میں، اب جسم میں بھٹکتا ہوں

لبوں سے چُوم لو، آنکھوں سے تھام لو مجھ کو
تمہیں سے جنموں تو شاید مجھے پناہ ملے

# وہ جو شاعر تھا

وہ جو شاعر تھا، چُپ سا رہتا تھا
بہکی بہکی سی باتیں کرتا تھا
آنکھیں کانوں پہ رکھ کے سُنتا تھا
گُونگی خاموشیوں کی آوازیں
جمع کرتا تھا چاند کے سائے
گیلی گیلی سی نُور کی بُوندیں
اوک میں بھر کے کھڑکھڑاتا تھا
رُوکھے رُوکھے سے رات کے پتّے
وقت کے اِس گھنیرے جنگل میں
کچّے پکّے سے لمحے چنتا تھا

ہاں، وہی، وہ عجیب سا شاعر
رات کو اُٹھ کے کہنیوں کے بل
چاند کی ٹھوڑی چُوما کرتا تھا

چاند سے گر کے مر گیا ہے وہ
لوگ کہتے ہیں خودکشی کی ہے

# قبریں

کیسے چپ چاپ ہی مر جاتے ہیں کچھ لوگ یہاں
جسم کی ٹھنڈی سی
تاریک سیہ قبر کے اندر
نہ کسی سانس کی آواز، نہ سِسکی کوئی
نہ کوئی آہ، نہ جنبش، نہ ہی آہٹ کوئی

ایسے چُپ چاپ ہی مر جاتے ہیں کُچھ لوگ یہاں
اُن کو دفنانے کی زحمت بھی اُٹھانا نہیں پڑتی

# جسم

فلک پہ اُڑتے ہیں ٹھنڈے ٹھنڈے سُبک جزیرے سے بادلوں کے
اُفق کے سندھوری سے کنارے پگھل کے پانی میں بہہ رہے ہیں
وسیع تر ہوگئی ہے وسعت!

تمہاری باہوں میں ڈوب کر ایسے ہلکا ہلکا سا لگ رہا ہے
کہ جسم سے جیسے سینکڑوں جسم اُتر گئے ہیں
کہ رُوح سے جیسے جسم کا بوجھ ہٹ گیا ہے

# ماضی

اور گائیڈ بتا رہا تھا ہمیں
شاہ عالیٰ کی خواب گاہ تھی یہ
ہیرے موتی جڑے پلنگ تھے یہاں
اِن دریچوں پہ موتیوں سے بَنی
چِلمنیں ٹانگی جایا کرتی تھیں

وہ نشاں گِن کے دیکھئے چھت پر
نو سو پینتیس کانچ کے فانُوس
رات میں جگمگایا کرتے تھے
جشنِ شعر و شراب رہتا تھا
رات بھر رقص چلتے رہتے تھے
سات سو بارہ اُونٹوں پر لد کر

ملکِ ایران سے آئے تھے قالین
گُلبدن بیگمات..... کہتے ہیں
پاؤں رکھتیں تو ڈوب جاتے تھے
رات دن اُن کے قہقہوں سے محل
تان پُورہ سا گُونجا کرتا تھا
وہ زمانے ہی اور تھے صاحب

کہتے کہتے ہجوم کو لے کر
بڑھ گیا مقناطیس کا ٹکڑا
اب اکیلا کھڑا ہوں کھنڈر میں
ایک جھینگر کی آ رہی ہے صدا

# سِیلن

بس ایک ہی سُر میں، ایک ہی لَے پہ صبح سے دیکھ ____
دیکھ کیسے بَرس رہا ہے اُداس پانی
پھوار کے ململیں دوپٹے سے اُڑ رہے ہیں
تمام موسم ٹپک رہا ہے
پلک پلک رِس رہی ہے یہ کائنات ساری
ہر ایک شے بھیگ بھیگ کر دیکھ کیسی بوجھل سی ہو گئی ہے
دماغ کی گیلی گیلی سوچوں سے
بھیگی بھیگی اُداس یادیں ٹپک رہی ہیں
تھکے تھکے سے بدن میں بس دِھیرے دِھیرے ____
سانسوں کا گرم لوبان جل رہا ہے

# ڈائری

نہ جانے کِس کی یہ ڈائری ہے
نہ نام ہے، نہ پتہ ہے کوئی:

"ہر ایک کروٹ میں یاد کرتا ہوں تم کو لیکن
یہ کروٹیں لیتے رات دن یوں مسل رہے ہیں مرے بدن کو
تمہاری یادوں کے جسم پر نیل پڑ گئے ہیں"

ایک اور صفحے پہ یوں لکھا ہے:
" کبھی کبھی رات کی سیاہی،
کُچھ ایسی چہرے پہ جم سی جاتی ہے
لاکھ رگڑوں،
سحر کے پانی سے لاکھ دھوؤں

مگر وہ کالک نہیں اُترتی
مِلو گی جب تم پتہ چلے گا
میں اور بھی کالا ہو گیا ہوں"
یہ حاشیے میں لکھا ہُوا ہے:
"میں دُھوپ میں جل کے اتنا کالا نہیں ہوا تھا
کہ جتنا اس رات میں سُلگ کے سیہ ہوا ہوں"

مہین لفظوں میں اک جگہ یوں لکھا ہے اُس نے:
"تمھیں بھی تو یاد ہو گی وہ رات سَردیوں کی
جب اوندھی کشتی کے نیچے ہم نے
بدن کے چُولہے جلا کے تاپے تھے، دِن کیا تھا
یہ پتھروں کا بچھونا ہرگز نہ سخت لگتا جو تم بھی ہوتیں
تمھیں بچھاتا بھی اوڑھتا بھی"

اک اور صفحے پہ پھر اُسی رات کا بیان ہے:
"تم ایک تکیے میں گیلے بالوں کی بھر کے خوشبو،
جو آج بھیجو
تو نیند آجائے، سو ہی جاؤں"

کچھ ایسا لگتا ہے، جس نے بھی ڈائری لکھی ہے
وہ شہر آیا ہے گاؤں میں چھوڑ کر کسی کو
تلاش میں کام ہی کے شاید:
"میں شہر کی اِس مشین میں فِٹ ہوں جیسے ڈِھبری،
ضروری ہے یہ ذرا سا پرزہ
اہم بھی ہے کیوں کہ روز کے روز تیل دے کر
اِسے ذرا اور کَس کے جاتا ہے چیف میرا
وہ روز کستا ہے،
روز اک پیچ اور چڑھتا ہے جب نسوں پر،
تو جی میں آتا ہے زہر کھا لوں
یا بھاگ جاؤں"

کچھ اُکھڑے اُکھڑے، کٹے ہوئے سے عجیب جملے!
" کہانی وہ جس میں ایک شہزادی چاٹ لیتی ہے
اپنی انگشتری کا ہیرا،
وہ تم نے پُوری نہیں سُنائی"

" کڑوں میں سونا نہیں ہے،
اُن پر سُنہری پانی چڑھا ہوا ہے"

اِک اور زیور کا ذکر بھی ہے:
"وہ ناک کی نتھ نہ بیچنا تم
وہ جُھوٹا موتی ہے، تم سے سُچّا کہا تھا میں نے،
سُنار کے پاس جا کے شرمندگی سی ہو گی"

یہ وقت کا تھان کُھلتا رہتا ہے پل بہ پل،
اور لوگ پوشاکیں کاٹ کر،
اپنے اپنے انداز سے پہنتے ہیں وقت لیکن
جو میں نے کاٹی تھی تھان سے اِک قمیض
وہ تنگ ہو رہی ہے!"

کبھی کبھی اس پگھلتے لوہے کی گرم بھٹّی میں کام کرتے،
ٹھِٹھرنے لگتا ہے یہ بدن جیسے سخت سردی میں بھُن رہا ہو،
بخار رہتا ہے کچھ دنوں سے"

مگر یہ سطریں بڑی عجب ہیں
کہیں توازن بگڑ گیا ہے
یا کوئی سِیون اُدھڑ گئی ہے:
"فرار ہوں میں کئی دِنوں سے

جو گُھپ اندھیرے کی تیر جیسی سُرنگ اک کان سے
شروع ہو کے دوسرے کان تک گئی ہے،
میں اُس نلی میں چُھپا ہوا ہوں،
تم آ کے تنکے سے مجھ کو باہر نکال لینا

" کوئی نہیں آئے گا یہ کیڑے نکالنے اب
کہ ان کو تو شہر میں دُھواں دے کے مارا جاتا ہے نالیوں میں "

# ایک اور دن

خالی ڈبّہ ہے فقط، کھولا ہوا چیرا ہوا
یوں ہی دیواروں سے بھِڑتا ہوا، ٹکراتا ہوا
بے سَبب سڑکوں پر بکھرا ہوا پھیلایا ہوا
ٹھوکریں کھاتا ہوا، خالی لڑھکتا ڈبّہ

ایسا ہوتا ہے کوئی خالی سا بیکار سَا دن
ایسا بے رنگ سا، بے معنی سا بے نام سا دن

# الاؤ

رات بھر سرد ہوا چلتی رہی
رات بھر ہم نے الاؤ تاپا

میں نے ماضی سے کئی خشک سی شاخیں کاٹیں
تم نے بھی گزرے ہوئے لمحوں کے پتّے توڑے
میں نے جیبوں سے نکالیں سبھی سوکھی نظمیں
تم نے بھی ہاتھوں سے مرجھائے ہوئے خط کھولے
اپنی ان آنکھوں سے میں نے کئی مانجے توڑے
اور ہاتھوں سے کئی باسی لکیریں پھینکیں
تم نے پلکوں پہ نمی سوکھ گئی تھی سو، گرا دی
رات بھر جو بھی ملا اُگتے بدن پر ہم کو
کاٹ کے ڈال دیا جلتے الاؤ میں اُسے

رات بھر پھونکوں سے ہر لَو کو جگائے رکھا
اور دو جسموں کے ایندھن کو جلائے رکھا
رات بھر بجھتے ہوئے رِشتے کو تاپا ہم نے

## بہلاوا

تم نے سوچا تو ہوگا ـــــ دیکھا نہیں
خُشک صحرا پہ جب برس جائے
ایک چھَلکا ہُوا ابھرا ساون
دیر تک ریت سنسناتی ہے

ایک موہوم سی اُمیّد لئے
شاید اب کے کہیں کوئی کونپل
جنم لیتی ہُوئی نظر آئے
بانجھ صحرا کی گود بھر جائے

# نظم

نظم اُلجھی ہوئی ہے سینے میں
مِصرعے اٹکے ہوئے ہیں ہونٹوں پر
لفظ کاغذ پہ بیٹھتے ہی نہیں
اُڑتے پھِرتے ہیں تِتلیوں کی طرح
کب سے بیٹھا ہُوا ہوں میں جانم
سادہ کاغذ پہ لکھ کے نام ترا

بس ترا نام ہی مکمّل ہے
اس سے بہتر بھی نظم کیا ہو گی!

# ابھی نہ پردہ گراؤ

ابھی نہ پردہ گراؤ، ٹھہرو، کہ داستان آگے اور بھی ہے
ابھی نہ پردہ گراؤ، ٹھہرو
ابھی تو ٹوٹی ہے کچّی مٹی، ابھی تو بس جسم ہی گرے ہیں
ابھی تو کردار ہی بُجھے ہیں
ابھی سُلگتے ہیں رُوح کے غم،
ابھی دھڑکتے ہیں درد دل کے
ابھی تو احساس جی رہا ہے

یہ لَو بچالو، جو تھک کے کردار کی ہتھیلی سے گر پڑی ہے
یہ لَو بچالو، یہیں سے اٹھے گی جستجو پھر بگُولا بن کر
یہیں سے اٹھے گا کوئی کردار پھر اسی روشنی کو لے کر
کہیں تو انجام و جُستجُو کے سِرے ملیں گے
ابھی نہ پردہ گراؤ، ٹھہرو!

# مُستقل

کُچھ بھی قائم نہیں ہے، کُچھ بھی نہیں
رات دِن رگر رہے ہیں چَوسر پر
اَوندھی سِیدھی سی کوڑیوں کی طرح
ہاتھ لگتے ہیں ماہ وسال مگر
انگلیوں سے پھسلتے رہتے ہیں
دُھوپ چھاؤں کی دوڑ ہے ساری
کچھ بھی قائم نہیں ہے، کچھ بھی نہیں

اور جو قائم ہے بس۔اک میں ہوں
میں جو پَل پَل بدلتا رہتا ہوں

# ایندھن

چھوٹے تھے، ماں اُپلے تھاپا کرتی تھی
ہم اُپلوں پر شکلیں گوندھا کرتے تھے
آنکھ لگا کر ___ کان بنا کر
ناک سجا کر
پگڑی والا، ٹوپی والا،
میرا اُپلا، تیرا اُپلا
اپنے اپنے جانے پہچانے ناموں سے
اُپلے تھاپا کرتے تھے

ہنستا ہنستا سُورج روز سویرے آ کر
گوبر کے اُپلوں پر کھیلا کرتا تھا
رات کو آنگن میں جب چُولہا جلتا تھا

ہم سب اس کو گھیر کے بیٹھے رہتے تھے
کس اُپلے کی باری آئی
کس کا اُپلا راکھ ہُوا
وہ پنڈت تھا
اِک مُنّا تھا
اِک وشرتھ تھا

برسوں بعد
شمشان میں بیٹھا سوچ رہا ہوں
آج کی رات اِس وقت کے جلتے چولہے میں
اک دوست کا اُپلا اور گیا

# بے خودی

دو سَوندھے سَوندھے سے جسم جس وقت،
ایک مٹھی میں سو رہے تھے
لبوں کی مدّھم طویل سرگوشیوں میں سانسیں اُلجھ گئی تھیں
مُندے ہوئے ساحلوں پہ جیسے کہیں بہت دُور
ٹھنڈا ساون برس رہا تھا
بس ایک ہی رُوح جاگتی تھی

بتا تو اُس وقت میں کہاں تھا؟
بتا تو اُس وقت تُو کہاں تھی؟

# مسیحا

کندھے جُھک جاتے ہیں جب بوجھ سے اِس لمبے سفر کے
ہانپ جاتا ہوں میں جب چڑھتے ہُوئے تیز چڑھائیں
سانسیں رہ جاتی ہیں جب سینے میں گچھّا ہو کر
اور لگتا ہے کہ دَم ٹُوٹ ہی جائے گا یہیں

ایک ننّھی سی مری نظم، مرے سامنے آ کر
مجھ سے کہتی ہے مرا ہاتھ پکڑ کر، "مرے شاعر،
لا مرے کندھوں پہ رکھ دے
میں ترا بوجھ اُٹھا لوں"

# بوسکی

وقت کو آتے نہ جاتے نہ گزرتے دیکھا
نہ اُترتے ہوئے دیکھا کبھی الہام کی صورت
جمع ہوتے ہوئے اک جگہ مگر دیکھا ہے

شاید آیا تھا وہ خوابوں سے دبے پاؤں ہی
اور جب آیا خیالوں کو بھی احساس نہ تھا
آنکھ کا رنگ طلوع ہوتے ہوئے دیکھا جس دن
میں نے چُوما تھا مگر وقت کو پہچانا نہ تھا

چند تُتلائے ہوئے بولوں میں آہٹ بھی سُنی
دُودھ کا دانت گرا تھا تو وہاں بھی دیکھا
بوسکی بیٹی مری، چکنی سی ریشم کی ڈلی

لپٹی لپٹائی ہوئی ریشمی تاگوں میں پڑی تھی
مجھ کو احساس نہیں تھا کہ وہاں وقت پڑا ہے

پالنا کھول کے جب میں نے اُتارا تھا اُسے بستر پر
لوری کے بولوں سے اک بار چُھوا تھا اس کو
بڑھتے ناخونوں میں ہر بار تراشا بھی تھا
چُوڑیاں چڑھتی اُترتی تھیں کلائی پر مسلسل
اور ہاتھوں سے اُترتی کبھی چڑھتی تھیں کتابیں
مجھ کو معلوم نہیں تھا کہ وہاں وقت لکھا ہے

وقت کو آتے نہ جاتے نہ گُزرتے دیکھا
جمع ہوتے ہوئے دیکھا مگر اس کو میں نے
اس برس بوسکی اٹھارہ برس کی ہو گی

# چمپئی دھوپ

خلاؤں میں تیرتے جزیروں پہ چمپئی دُھوپ،
دیکھ کیسے برس رہی ہے!
مہین کہرا سمٹ رہا ہے
ہتھیلیوں میں ابھی تلک
تیرے نرم چہرے کا لمس ایسے چھلک رہا ہے
کہ جیسے صبح کو اوک میں بھر لیا ہو میں نے
بس ایک مدّھم سی روشنی
میرے ہاتھوں پیروں میں بہہ رہی ہے

ترے لبوں پہ زبان رکھ کر
میں نُور کا وہ حسین قطرہ بھی پی گیا ہوں
جو تیری اُجلی دُھلی ہوئی رُوح سے پھسل کر ترے لبوں پر
ٹھہر گیا تھا

# پائینیر دس

اَن گنت زندہ و مُردہ تارے
اَن گنت زندہ و مُردہ سے چاند
گنگناتے ہوئے گیسوں کے اڈتے ہوئے سَیلابوں میں
جُگنوؤں کی طرح بکھرے ہوئے لاکھوں سُورج
بیکراں ٹھنڈی خلاؤں کی خموشی کا جہاں
فاصلے جس کے،
کئی اربوں میں گننے سے بھی کم پڑتے ہیں
"پائنیرَ دس" کا سخن ورر ہرو
ایسی کائنات سے اُڑتا ہُوا نکلا ہے
تیز بجلی کی سی حسّاس رگوں سے چھوکر
اپنی پہچان کی تصویریں اکٹھی کِیے جاتا ہے،
رکھے جاتا ہے

جس طرح چھوٹی سی اِس گرم زمیں پر
بے پنہ زندہ و بے جان خلاؤں سے گزرتا شاعر
اپنی پہچان کی تصویریں اکٹھی کِئے جاتا ہے
لِکھے جاتا ہے!

# صَلیب

چِھل رہا ہے میرا کندھا، اے خداوند!
مرا دایاں کندھا،
اور یہ چیڑ کی لکڑی کی صَلیب
اِتنی وزنی ہے کہ کندھا نہیں بدلا جاتا
اِک ذرا ہاتھ لگا کر اِسے اوپر کر دے

پاؤں جمتے نہیں کُہسار پہ اب چڑھتے ہوئے
ننگے پیروں میں بہت چُبھتی ہیں کانٹے ہوئے، کیکر کی جڑیں
گو کئی بار چڑھا ہوں اسی کُہسار پہ میں
تیرے پیغام، ترے نام کی تلقیں کے لئے
اور اکیلے میں ترے ساتھ کئی راتیں گزاری ہیں یہیں
گِڑ گِڑایا ہوں، تجھے پُوجا ہے، باتیں کی ہیں

تو نے پھُونکوں سے ہٹائے ہیں پہاڑوں کے پہاڑ
میرے تلوے میں لڑھکتا ہوا روڑہ ہے، ذرا اُس کو ہٹا دے
ساتھ چلتے ہوئے یہ رُومی سپاہی جو مجھے ہانک رہے ہیں
پَل کو رکتا ہوں تو اُن کی ٹھوکر
سیدھی ہڈّی پہ جو لگتی ہے تو اُف.....!
ڈرتا ہوں چیخ نکل جائے نہ ہونٹوں سے کہیں
چیخ نکلے گی تو یہ لوگ ترے،
تیرے بچے ہوئے آدم سارے
مجھ کو دیکھیں گے حقارت سے بھری نظروں سے
اور سمجھیں گے کہ میں جُھوٹا تھا
کیسے سہمے ہوئے سب ڈھونڈ رہے ہیں میرے پیچھے تجھ کو
میں ترا بیٹا ہوں، یہ اُن سے کہا تھا میں نے
اُن کو اُمید ہے تو آئے گا اور معجزہ ہوگا کوئی
تُو بتا آئے گا؟
کب آئے گا تُو؟
معجزے کِتنے دکھائے میں نے تیری خاطر
اپنے بیٹے کے لیے تُو بھی کوئی معجزہ کر دے

کوئی پتّہ نہیں ہلتا تیری مرضی کے بِنا،
کوئی، چڑیا نہیں گرتی جو ترا حکم نہ ہو،
میرے ماتھے پہ لگے تاج میں دیکھ،
ایک مکّھی ہے
بڑی دیر سے کانٹوں میں پھنسی ہے،
بِھنبھناتی ہے مرے زخموں پہ،
اپنی انگلی سے اٹھا کر اُسے آزاد ہی کر دے
میرے ماتھے سے ٹپکتی ہوئی خُوں کی بُوندیں
اب تو آنکھوں میں چلی آئی ہیں،
تُو بتا آنکھ میں جھپکوں کیسے؟

تُو مجھے دیکھ رہا ہے یا نہیں؟
بول، بتا، کوئی اِشارہ تو دِکھا
یا تجھے میرے سوا اور بہت کام ہیں، مَصروف ہے تُو؟
میری بَرداشت اگر ٹُوٹ گئی،
گِر پڑے گی یہاں تیری بھی اَنا،
اور یہ چیڑ کی لکڑی کی صَلیب
اِمتحاں تیرا ہے، میرا تو نہیں!
سَر پہ لٹکے ہوئے شعلے کو ذرا دُور تو کر

تُو نے مرضی سے جلایا ہے، بُجھایا ہے یہ سُورج اکثر
آج بس میرے لیے تھوڑا سا مدّھم کر دے،
میری آنکھوں میں اندھیرا سا اُتر آیا ہے

ماس کا لوتھڑا کندھے سے لٹکنے لگا ہے اب تو،
اور ہڈّی سے رگڑتی ہے یہ لکڑی تو صدا آتی ہے
میرے اعمال تو تھے تیرے لیے،
اور اعمال اگر میرے نہیں،
یہ نہیں میری صلیب،
آ کے اِسے تُو ہی اُٹھا!

تھوڑا سا فاصلہ باقی ہے،
جہاں تجھ کو یہ مصلُوب کریں گے سارے،
تُو وہاں آئے گا کیا؟
مجھ کو اُمید نہیں
نسلِ آدم سے کوئی بدلہ لیا ہے تُو نے؟
بادشاہوں کی طرح تجھ کو بھی عادت تو نہیں ایسے تماشوں کی کہیں؟
میں تیری رَمز کو سمجھا ہی نہیں ہوں شاید!

سر کوہسار وہاں........
جب میں پہنچوں گا تو کیا ہوگا، خبر ہے تجھ کو؟
مجھ کو اس چیڑ کے شہتیر پہ میخوں سے کسا جائے گا
میری ماں بھی،
تُو جسے جانتا ہے،
لوگوں کی بِھیڑ کے پیچھے کہیں بیٹھی ہوگی
یہ وہی لوگ ہیں جن کو میں نے
معجزوں کی ترے تفصیل سنائی تھی کبھی
جن کو سُن کر وہ سبھی
تجھ پہ ایمان بھی لاتے رہے سہمے سہمے
میں نے تو چاہا تھا وہ تیری محبت میں جئیں
اُن کی آنکھیں تھیں مگر تیری کوئی شکل نہ تھی
کان تھے سب کے، مگر تُو نے کبھی بات نہ کی

میں نے تمثیلیں گھڑیں
تیری آواز سُنانے کے لیے
اور تری شکل دِکھانے کے لیے
ورنہ کیسے اُنہیں سمجھاتا کہ تو کیا ہے!
اب بھی مہلت ہے کہ تُو اپنی اَنا ہی کے لیے

معجزہ کرلے کوئی!
ورنہ تمثیل ہی رہ جائے گا تُو!

بعد کے وقتوں میں پھر
صرف تمثیلوں کی لوگوں میں پَرستِش ہوگی
اور تمثیلوں کی تَصدیق کی خاطِر
پھر مرے نام سے خُوں ہوگا
جو ترے نام سے اِس بار ہوا

(آرتھر کوئسلر کی ایک کتاب "کال گرلز" کے دِیباچے سے انسپائرڈ)

# موسم

برف پگھلے گی جب پہاڑوں سے
اور وادی میں کُہرہ سمٹے گا
بیج انگڑائی لے کے جاگیں گے
اپنی السائی آنکھیں کھولیں گے
سبزہ بہہ نکلے گا ڈھلانوں پر

غور سے دیکھنا بہاروں میں
پچھلے موسم کے بھی نشاں ہوں گے
کونپلوں کی اُداس آنکھوں میں
آنسوؤں کی نمی بچی ہوگی

# حراسَت

دُھندلائی ہوئی شام تھی
السائی ہوئی سی
اور وقت بھی باسی تھا میں جب شہر میں آیا
ہر شاخ سے لپٹے ہوئے سنّاٹے کھڑے تھے
دِیواروں سے چپکی ہوئی خاموشی پڑی تھی
راہوں میں نفس کوئی نہ پرچھائیں نہ سایہ
اُن گلیوں میں، کُوچوں میں، اندھیرا نہ اُجالا
دَروازوں کے پَٹ بَند تھے، خالی تھے دریچے
بس وقت کے کچھ باسی سے ٹکڑے تھے، پڑے تھے

میں گُھومتا پھرتا تھا سرِ شہر اکیلا
دَروازوں پہ آواز لگاتا تھا، کوئی ہے؟
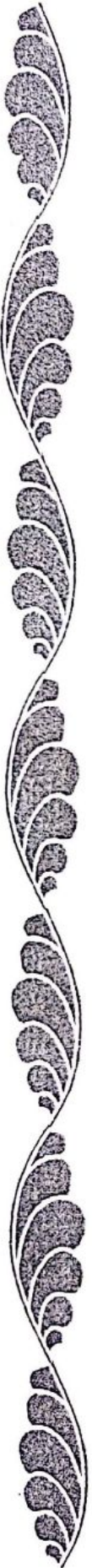
ہر موڑ پہ رُک جاتا تھا___ شاید کوئی آئے
لیکن کوئی آہٹ، کوئی سایہ بھی نہ آیا

یہ شہر اچانک ہی مگر جاگ پڑا ہے
آوازیں حراست میں لیے مجھ کو کھڑی ہیں
آوازوں کے اِس شہر میں، میں قید پڑا ہوں

# وَعدہ

مجھ سے اک نظم کا وَعدہ ہے ملے گی مجھ کو
ڈُوبتی نبضوں میں جب درد کو نیند آنے لگے
زَرد سا چہرہ لیے چاند اُفق پر پہنچے
دِن ابھی پانی میں ہو، رات کِنارے کے قریب
نہ اندھیرا نہ اُجالا ہو نہ یہ رات نہ دن

جسم جب ختم ہو اور رُوح کو جب سانس آئے
مجھ سے اک نظم کا وعدہ ہے ملے گی مجھ کو

# ہم دم

موڑ پہ دیکھا ہے وہ بوڑھا سا اک پیڑ کبھی؟
میرا واقف ہے، بہت سالوں سے، میں اُسے جانتا ہوں

جب میں چھوٹا تھا تو اک آم اُڑانے کے لیے
پرَلی دیوار سے کندھوں پہ چڑھا تھا اُس کے
جانے دُکھتی ہوئی کس شاخ سے جا پاؤں لگا
دَھاڑ سے پھینک دیا تھا مجھے نیچے اُس نے
میں نے کھنّس میں بہت پھینکے تھے پتّھر اُس پر

میری شادی پہ مُجھے یاد ہے شاخیں دے کر
میری ویدی کا ہون گرم کیا تھا اُس نے

اور جب حاملہ تھی 'بیبا'، تو دوپہر میں ہر دن
میری بیوی کی طرف کیریاں پھینکی تھی اُسی نے

وقت کے ساتھ سبھی پھول سبھی پتّے گئے
تب بھی جل جاتا تھا جب مُنّے سے کہتی بیبا
"ہاں اُسی پیڑ سے آیا ہے تُو، پیڑ کا پھل ہے"
اب بھی جل جاتا ہوں جب موڑ گزرتے میں کبھی
کھانس کر کہتا ہے، "کیوں، سَر کے سبھی بال گئے؟"

صبح سے کاٹ رہے ہیں وہ کمیٹی والے
موڑ تک جانے کی ہمّت نہیں ہوتی مجھ کو!

# ایک اور رات

رات چُپ چاپ دبے پاؤں چلے جاتی ہے
رات خاموش ہے، رَوتی نہیں، ہنستی بھی نہیں
کانچ کا نِیلا سا گنبد ہے اُڑا جاتا ہے
خالی خالی کوئی بجرا سا بہا جاتا ہے

چاند کی کِرنوں میں وہ رَوز سا ریشم بھی نہیں
چاند کی چکنی ڈلی ہے کہ گھلی جاتی ہے
اور سنّاٹوں کی اِک دُھول اُڑی جاتی ہے

کاش اِک بار کبھی نیند سے اُٹھ کر تم بھی
ہجر کی راتوں میں یہ دیکھو تو کیا ہوتا ہے

# روح دیکھی ہے کبھی!

رُوح دیکھی ہے؟
کبھی رُوح کو محسوس کِیا ہے؟
جاگتے جیتے ہوئے دُودھیا کُہرے سے لپٹ کر
سانس لیتے ہوئے اُس کُہرے کو محسوس کِیا ہے؟

یا شِکارے میں کسی جھیل پہ جب رات بسر ہو
اور پانی کے چھَپاکوں میں بجا کرتی ہوں ٹلّیاں
سُبکیاں لیتی ہواؤں کے کبھی بَین سُنے ہیں؟

چودھویں رات کے برفاب سے اِک چاند کو جب
ڈھیر سے سائے پکڑنے کے لیے بھاگتے ہیں
تم نے ساحل پہ کھڑے، گرجے کی دیوار سے لگ کر
اپنی گہناتی ہوئی کوکھ کو محسوس کِیا ہے؟

جسم سو بار جلے تب بھی وہی مٹّی ہے
رُوح اک بار جلے گی تو وہ کُندن ہوگی
رُوح دیکھی ہے، کبھی رُوح کو محسوس کِیا ہے؟

# گِرادو پَردہ

گِرادو پَردہ کہ داستاں خالی ہوگئی ہے
گِرادو پَردہ کہ خُوبصورت اُداس چہرے
خلا میں تحلیل ہوگئے ہیں
غَریب آنکھوں سے رُوٹھ کر ایک ایک آنسو اُتر گیا ہے

صَدائیں اپنے سُروں سے اُٹھ کر چلی گئی ہیں
بس ایک اَحساس کی خموشی ہی گونجتی ہے

گِرادو پَردہ کہ داستاں خالی ہوگئی ہے

# پھِر کوئی نظم کہیں

آؤ پھر نظم کہیں
پھِر کسی درد کو سہلا کے سُجا لیں آنکھیں
پھِر کسی دُکھتی ہوئی رگ سے چھوا دیں نشتر
یا کسی بھُولی ہوئی راہ پہ مُڑ کے اِک بار
نام لے کر کسی ہمنام کو آواز ہی دیں
پھِر کوئی نظم کہیں

# سورنا

فلک میں دیکھے تھے اُڑتے اُڑتے
وہ شہرِ شب کے
وہ سانولی روشنی کے پیچھے سے جگمگاتے
جَزیرے شب کے
وہ دو جَزیرے
وہ "بن لتاسَین" سی "سورنا" کی کالی کالی بڑی سی آنکھیں

ہوانوردی میں آتے جاتے
ہمیشہ پَرواز میں ملی ہے
پروتی رہتی ہے شہر دونوں
کہ جیسے آنکھیں پرو کے رکھتی اِک نظر میں
وہ کہکشاں کے سُروں پہ اُڑتے
پَرندے شب کے

نئے نئے ایک اور 'نووا' سے پیدا ہوتے
ستارے شب کے
دو رات بہنیں
وہ بن لتا سین سی سورنا کی کالی کالی بڑی سی آنکھیں!

جو سات سیاروں نے بلو کے تمہارے لمحے
چھلک کے پھر کہکشاں کی گردش میں کھو نہ جائیں
بکھر نہ جائیں

ہمیشہ ملتی ہو آسماں کی اُڑان میں تم
کبھی ہواؤں کے اس دباؤ سے نیچے اترو
زمیں پہ پاؤں لگا کے دیکھو
زمیں پہ بھی ہیں تمہاری آنکھوں سے کچھ سمندر
اگرچہ اتنے سیہ نہیں ہیں
نہ اتنے گہرے!

---

۱ بنگالی کے ایک مشہور شاعر تھے جیونا نند داس، ان کی ایک بہت مشہور نظم ہے جس میں بن لتا سین کی کالی آنکھوں کا ذکر ہے، بن لتا سین اُسی حوالہ سے استعمال کیا ہے۔

۲ سورنا ائیر ہوسٹس ہے۔

# ایک اٹھنّی

آڑ سے ہو کے،
گھنے پیڑوں کے پیچھے سے کبھی
اور کبھی شہر کی دیوار سے لگتے چھپتے
کوڑیالوں سے جو بچ بچ کے نکل آئی ہے رات
ہاتھ میں چاند کی چمکیلی اٹھنّی لے کر
گھر سے بھاگی ہے کسی میلے میں جانے کے لیے

جی میں آتا ہے کہ بس ہاتھ پکڑ کر اس کو
صبح کے میلے میں لے جاؤں، کھلونے لے دوں

# مینہہ

بستہ پھینک کے لوچی بھاگا روشن آرا باغ کی جانب
چلّاتا" چل گڈی چل!
پکّے جامن ٹپکیں گے"

آنگن کی رسّی سے ماں نے کپڑے کھولے
اور تنّور پہ لا کے ٹین کی چادر ڈالی

سارے دِن کے سُوکھے پاپڑ
لچھی نے چادر میں لپیٹے
"بچ گئی ربّا ___ کیا کرایا دُھل جانا تھا"

خیرُو نے اپنے کھیتوں کی سُوکھی مٹّی

جھُرّیوں والے ہاتھ میں لے کر
بھِیگی بھِیگی آنکھوں سے پھر اُوپر دیکھا

جھُوم کے پھر اُٹھے ہیں بادل
ٹوٹ کے پھر مینہہ برسے گا

# لوری

سُنہری سُنہری کُونجیں جب اُڑتے اُڑتے اُفق کی ٹہنی پہ بیٹھ جائیں
تمہارے کندھوں پہ جھک کے جب شام بوسہ لے لے
چراغ کھولیں جب اپنی مدّھم اُداس آنکھیں
تم اپنے چہرے پہ کھینچ لینا حیا کا آنچل
میں ہولے ہولے مَنا کے آنچل اُتار لُوں گا

تمہارے ہَونٹوں کے ٹھنڈے ٹھنڈے گلاب
آنکھوں پہ رکھ کے میں،
رات کو سُناؤں گا پھر اُسی نیند کی کہانی
وہ نیند جو جاگتے ملی تھی تمہاری آغوش کے سکوں میں

# پاکیزہ

مِٹا دو سارے نِشاں کہ تھے تم
ہلو تو جُنبش نہ ہو کہیں پر
اُٹھو تو ایسے کہ کوئی پتّہ ہلے نہ جاگے
لِباس کا ایک ایک تاگا اُتار کر یوں اُٹھو
کہ آہٹ سے چھو نہ جاؤ
ابھی یہیں تھے
ابھی نہیں ہو
خیال رکھنا کہ زندگی کی کوئی بھی سلوٹ
نہ موت کے پاک صاف چہرے کے ساتھ جائے

# ایک پتہ

یہاں سے ذرا آگے چل کر
پھٹی سی دری پر
پُرانا سا
اِک آدمی سا ملے گا
ادھورا سا چہرہ ہے
اَوندھا پڑا، ایک کاسہ سنبھالے
بھکاری ہے پر مانگتا کچھ نہیں ہے



وہاں سے اگر دائیں مُڑ جاؤ گے تو
دُکانوں کی لمبی قطاریں ملیں گی
مہاجر ہیں سارے ___!
وہ لکڑی کے کھونکھے دکانیں ہیں اُن کی

دُکانوں کے پیچھے ہی اِنچوں میں کھینچے ہوئے اُن کے گھر ہیں
یہ باہر سے آئے تھے، مسجد میں ہی آ کے بسنے لگے تھے
وہاں سے نکالے گئے ہیں
کہ گھر ہے خدا کا
خدا کے ہاں اتنی جگہ ہی کہاں ہے
وگرنہ تو سارے جہاں کو پناہ دینی پڑ جائے اُس کو

تو ہاں!
وہ پتہ میں بتانے لگا تھا
اسی راستے پر، دُکانوں سے آگے،
وہ مسجد ملے گی
وہ ابنِ ثناء اللہ سیّد ولی خاں کی مسجد
وہاں سے ذرا بائیں مُڑتے ہی نو دس قدم پر
بڑا ڈھیر اک کُوڑے کرکٹ کا تم کو نظر آئے گا
وہ مڑنے سے پہلے ہی تم سُونگھ لو گے
وہ گھٹتا تو ہے اور ہر روز بڑھتا بھی ہے
وہ اب اس علاقے میں
پہچان کا اِک نشاں بن گیا ہے

مگر اُس جگہ تم کو رُکنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے
ذرا دیر سیدھے ہی چلتے چلو تم
کتابوں کا بازار آئے گا آگے
وہیں زنگ آلود چھجّے کے نیچے سے گزرو گے جب تم
اندھیری سی دائیں طرف اِک گلی سی ملے گی
گلی بھی نہیں
اِس لیے کہ وہاں کچھ غریبوں نے گھر سے بنائے ہوئے ہیں
وہ گھر بھی نہیں
اِس لیے کہ وہاں کوئی دیوار یا کوئی کھڑکی نہیں
کوئی پردہ نہیں ہے
گزرتے ہوئے یوں لگے تم کو شاید
کسی سستے ناول کا،
ننگا سا اِک باب پڑھتے ہوئے چل رہے ہو

سنبھل کر نکلنا، پھسلنے کا ڈر ہے
کہ کھاتے پکاتے وہیں پر ہیں سارے
مگر اس سے بڑھ کر
یہ ڈر ہے کہیں تم
کسی زندہ مُردے پہ پاؤں نہ رکھ دو

کہ اِک مرتا ہے اور دو پیدا ہوتے ہیں روز اُس گلی میں

گلی سے نِکلتے ہی آنکھوں پہ جب ایک چھینٹا پڑے گا
چمکتی ہوئی دھوپ کا
تو ذرا دیر کچھ بھی دِکھائی نہ دے گا
ذرا آنکھیں مل کر،
اگر پار دیکھو
تو اِک چوک ہوگا
وہاں سے بہت پاس ہے وہ سڑک بھی
کہ جس پر تمھیں سارے 'پی ایم' کے 'جی ایم' کے بنگلے ملیں گے
اسی شاہراہ پر،
بہت آگے جا کر،
ہوائی جہازوں کا اڈّہ نیا بن رہا ہے
تمھیں کس سے ملنا تھا؟ ___ لیکن
نہیں! وہ نہیں جانتا میں
میں سمجھا کہ اپنے ہی گھر کا پتہ پُوچھتے تم یہاں آ گئے ہو"

# عادت

سانس لینا بھی کیسی عادت ہے
جیئے جانا بھی کیا روایت ہے
کوئی آہٹ نہیں بدن میں کہیں
کوئی سایہ نہیں ہے آنکھوں میں
پاؤں بے حِس ہیں چلتے جاتے ہیں
اِک سفر ہے جو بہتا رہتا ہے
کتِنے برسوں سے کِتنی صدیوں سے
جیئے جاتے ہیں۔ جیئے جاتے ہیں

عادتیں بھی عجیب ہوتی ہیں!

# گُل مہر

گیلی گیلی سی دُھوپ کے گُچھّے
ٹھنڈی ٹھنڈی سی آگ کی لپٹیں
سُرخ چمکیلا گُل مہر کا پیڑ

نیم تاریک بند کمرے سے
جب بھی دروازہ کھول کر نکلوں
سُرخ چمکیلی دُھوپ کا چھِینٹا
ایسے لگتا ہے آنکھ پر آکر
جیسے چنچل شریر اِک بچّہ
چوری چوری کواڑ سے کُود ے
"ہاہ" کہہ کر ڈرائے اور ہنس دے

# شاخیں

تھا تو سَر سبز، وہ پَودا تو ہرا تھا
اُس کی شاخیں تو توانا تھیں
مگر اُس کا کوئی قد نہ نکل پایا تھا
گو بہت سال وہ سینچا بھی گیا
میرے مالی کو مگر اس سے شکایت تھی
کبھی پھول نہ آئے اُس پر

اور کئی سال کے بعد
میرے مالی نے اُسے کھود نکالا ہے زَمیں سے
سارے باغیچے میں پھیلی ہوئی نکلی ہیں جڑیں
برسوں پالے ہوئے رِشتے کی طرح
جس کی شاخیں تو ہری رہتی ہیں، لیکن
اُس پر پھول پھل آتے نہیں
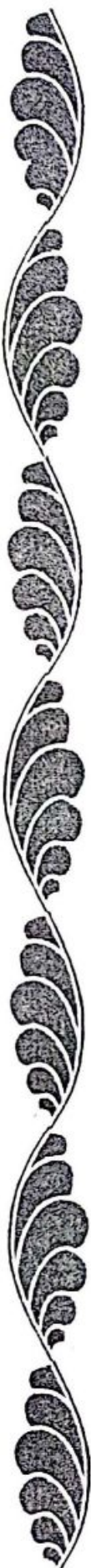
# رُخصت

جیسے جھنّا کے چٹخ جائے کسی ساز کا تار
جیسے ریشم کی کسی ڈور سے کٹ جائے ہے انگلی
ایسے اِک ضرب سی پڑتی ہے کہیں سینے میں
کھینچ کر توڑنی پڑ جاتی ہے جب تجھ سے نظر

تیرے جانے کی گھڑی، سخت گھڑی ہوتی ہے

پومپیئے، دفن تھا صدیوں سے جہاں
ایک تہذیب تھی پوشیدہ وہاں
شہر کھودا تو تواریخ کے ٹکڑے نکلے

ڈھیروں پتھرائے ہوئے وقت کے صفحوں کو اُلٹ کر دیکھا
ایک بھُولی ہوئی تہذیب کے پُرزے سے بچھے تھے ہر سُو
منجمد لاوے میں اکڑے ہوئے اِنسانوں کے گچھّے تھے وہاں
آگ اور لاوے سے گھبرا کے جو لِپٹے ہوں گے

وہی مٹکے، وہی ہانڈی، وہی ٹُوٹے پیالے
ہونٹ ٹوٹے ہوئے، لٹکی ہوئی مٹّی کی زبانیں ہر سُو
بھوک اس وقت بھی تھی، پیاس بھی تھی، پیٹ بھی تھا

حکمرانوں کے محل، اُن کی فصیلیں، سکّے
رائج الوقت جو ہتھیار تھے اور اُن کے دَستے
بیڑیاں پتھروں کی، آہنی، پیروں کے کڑے
اور غُلاموں کو جہاں باندھ کے رکھتے تھے
وہ پنجرے بھی بہت سے نکلے

ایک تہذیب یہاں دفن ہے اور اس کے قریب
ایک تہذیب رواں ہے،
جو مرے وقت کی ہے

حکمراں بھی ہیں، محل بھی ہیں، فصیلیں بھی ہیں
جیل خانے بھی ہیں اور گیس کے چیمبر بھی ہیں
ہیروشیما پہ کتابیں بھی سجا رکھی ہیں
بیڑیاں آہنی ہتھکڑیاں بھی اسٹیل کی ہیں
اور غُلاموں کو بھی آزادی ہے، باندھا نہیں جاتا

میری تہذیب نے اب کتنی ترقّی کی ہے

# بَتاشے

ہنسی کا جھاگ اُڑاؤ چمکتی کرنوں میں
کھلیں گے رنگ حسیں بُلبُلوں کے چہروں پر
یہ گول گول بَتاشے اُچھالو جھولی سے
بَراتیوں سے کہو لُوٹیں، کِھلکھلا کے ہنسیں
نظر میں مہکے حسیں مسکراہٹوں کی جھڑی
لَبوں سے اُونچے، حَسیں قد کے قہقہے چُھوٹیں

ہاں کوئی آنسو اگر آنکھ سے اُبلنے لگے
زمیں پہ پھینک کے بس پیر سے مَسل ڈالو
یہ زِندہ بُوند ہے بیٹی ـــــ
دہیج مانگے گی!

# تلاش

جی چاہے کہ
پتھر مار کے سُورج ٹکڑے ٹکڑے کر دوں
سارے فلک پر بکھرا دوں اس کانچ کے ٹکڑے

جی چاہے کہ
لمبی ایک کمند بنا کر
دور اُفق پر ہُک لگاؤں
کھینچ کے چادر چیر دوں سَر سے
جھانک کے دیکھوں پیچھے کیا ہے

شاید کوئی اور فلک ہو!

# سدّھارتھ کی ایک رات

کوئی پتّہ بھی نہیں ہلتا، نہ پردوں میں ہے جُنبش
پھر بھی کانوں میں بہت تیز ہواؤں کی صدا ہے

کتنے اُونچے ہیں یہ محراب محل کے
اور محرابوں سے اُونچا وہ ستاروں سے بھرا تھال فلک کا
کِتنا چھوٹا ہے مراقد.....
فرش پر جیسے کسی حرف سے اک نُقطہ ِگرا ہو.....
سینکڑوں سمتوں میں بھٹکا ہوا من ٹھہرے ذرا
دل دھڑکتا ہے تو بس دوڑتی ٹاپوں کی صدا آتی ہے

روشنی بند بھی کر دینے سے کیا ہوگا اندھیرا؟
صرف آنکھیں ہی نہیں دیکھ سکیں گی یہ چوگردہ،

رینگتے سانپوں کی پھُنکار تو بند ہو گی نہیں
میں اگر کانوں میں کچھ ٹھونس بھی لوں
روشنی چنتا کی تو ذہن سے اب بُجھ نہیں سکتی
خودکشی ایک اندھیرا ہے، اُپائے تو نہیں
کھڑکیاں ساری کھلی ہیں تو ہوا کیوں نہیں آتی؟
نیچے سردی ہے بہت اور ہَوا ٹھنڈ ہے شاید
دُور دَروازے کے باہر کھڑے وہ سنتری دونوں
شام سے آگ میں بس سُوکھی ہوئی ٹہنیوں کو جھونک رہے ہیں

میری آنکھوں سے وہ سُوکھا ہوا ڈھانچہ نہیں گرتا
جسم ہی جسم تو تھا، رُوح کہاں تھی اُس میں
کوڑھ تھا اُس کو؟ تپ دق تھا؟ نہ جانے کیا تھا؟
یا بڑھاپا ہی تھا شاید.....
پسلیاں سُوکھے ہوئے کیکروں کے شانچے جیسے
رَتھ پہ جاتے ہوئے دیکھا تھا
چٹانوں سے اُدھر.....
اپنی لاٹھی پہ گرے پیڑ کی مانند کھڑا تھا

پھر یکا یک یہ ہُوا.....
سارتھی، روک نہیں پایا تھا، منہ زور سَمے کی ٹاپیں......
رتھ کے پہیئے کے تلے دیکھا تڑپ کر اُسے ٹھنڈا ہوتے!
خُودکشی تھی؟ وہ سمرپن تھا؟ وہ دُرگھٹنا تھی؟
کیا تھا؟

سبز شاداب دَرختوں کے وجود
اپنے موسم میں تو بن مانگے بھی پھل دیتے ہیں
سُوکھ جاتے ہیں تو سب کاٹ کے
اس آگ میں ہی جھونک دیئے جاتے ہیں

جیسے دَروازے پہ اَعمال کے وہ دونوں فرشتے
شام سے آگ میں بس
سُوکھی ہوئی ٹہنیوں کو جھونک رہے ہیں

# شناخت

نہ نہ، رہنے دو مَت مِٹاؤ اِنہیں
اِن لکیروں کو یُوں ہی رہنے دو
ننّھے ننّھے گلابی ہاتھوں سے
میرے معصوم ننّھے بچّے نے
ٹیڑھی میڑھی لکیریں کھینچی ہیں

کیا ہُوا شکل بن سکی نہ اگر
میرے بچّے کے ہاتھ ہیں اِن میں
میری پہچان ہے لکیروں میں!

## اِمیجز

میں بھی اُس ہال میں بیٹھا تھا
جہاں پَردے پہ اک فِلم کے کِردار
زندہ جاوید نظر آتے تھے
اُن کی ہر بات بڑی، سوچ بڑی، کرم بڑے
اُن کا ہر ایک عَمل
ایک تمثیل تھی سب دیکھنے والوں کے لیے
میں اَداکار تھا اس میں
تم اَداکارہ تھیں
اپنے محبوب کا جب ہاتھ پکڑ کر تم نے
زندگی ایک نظر میں بھر کے
اُس کے سینے پہ بس اِک آنسو سے لکھ کر دے دی

کتنے سچّے تھے وہ کِردار
جو پَردے پر تھے
کِتنے فرضی تھے وہ دو، ہال میں بیٹھے سائے

# گُھٹن

جی میں آتا ہے کہ اِس کان سے سوراخ کروں
کھینچ کر دوسری جانب سے نکالوں اُس کو
ساری کی ساری نچوڑوں یہ رگیں، صاف کروں
بھر دوں ریشم کی جلائی ہوئی بُکّی ان میں

قہقہاتی ہوئی اِس بھیڑ میں شامِل ہو کر
میں بھی اِک بار ہنسوں، خُوب ہنسوں، خُوب ہنسوں

# دِل ڈُھونڈتا ہے

دِل ڈُھونڈتا ہے پھر وہی فُرصت کے رات دِن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے
غالبؔ

دِل ڈُھونڈتا ہے پھر وہی فُرصت کے رات دِن

جاڑوں کی نرم دُھوپ اور آنگن میں لیٹ کر
آنکھوں پہ کھینچ کر ترے آنچل کے سائے کو
اَوندھے پڑے رہیں، کبھی کروٹ لیے ہوئے

یا گرمیوں کی رات جب پُروائیاں چلیں
ٹھنڈی سفید چادروں پہ جاگیں دیر تک

تاروں کو دیکھتے رہیں چھت پر پڑے ہوئے

بَرفیلی سَردیوں کی کِسی رات میں کبھی
جا کر اُسی پہاڑ کے پہلو میں بیٹھ کر
وادی میں گونجتی ہوئی خاموشیاں سُنیں

دِل ڈُھونڈتا ہے پھر وہی فُرصت کے رات دِن

# موڑ

اِس موڑ سے جاتے ہیں کُچھ سست قدم رستے، کچھ تیز قدم راہیں
پتھر کی حَویلی کو، شیشے کے گھروندوں میں، تنکوں کے نشیمن تک

صحرا کی طرف جا کر اِک راہ بگولوں میں کھو جاتی ہے چکرا کر
رُک رُک کے جھجکتی سی
اِک موت کی ٹھنڈی سی وادی میں اُترتی ہے
اِک راہ اُدھڑتی سی، چھِلتی ہوئی کانٹوں سے
جنگل سے گزرتی ہے
اِک دَوڑ کے جاتی ہے اور کود کے گرتی ہے انجان خلاؤں میں

اُس موڑ پہ بیٹھا ہوں جس موڑ سے جاتی ہیں ہر ایک طرف راہیں

# اِنتظار

ٹھہرے ٹھہرے سے شانت ساگر میں
پھُولے پھُولے سے بادبانوں نے
اپنے بوجھل اُداس سِینوں میں
سانس بھر بھر کے تھام رکھی ہے

آج ساحل پہ گِر پڑا ہے سکُوت
آج پانی پہ رُک گئی ہے صَبا
ٹھہری ٹھہری ہے زِندگی ساری

تجھ سے ملنے کا اِنتظار سا ہے

# علیحدگی

مرے ساتھ رہتا تھا سایہ ہمیشہ
مگر اِن دنوں ہم الگ ہو گئے ہیں

اُسے یہ شکایت تھی مجھ سے
کہ اُس کو مِٹانے کی خاطر ہی میں یُوں
اَندھیروں میں چلتا ہوں
تا کہ وہ میرا تعاقب نہ کر پائے ___ لیکن
مجھے یہ شکایت تھی، میں روشنی میں
اکیلا بھی چل سکتا تھا
اور کوئی ڈر بھی نہیں تھا
اندھیرے میں جس وقت
مجھ کو ضرورت تھی اَحباب کی

وہ غائب تھا
اس کا نِشاں تک نہیں تھا

مرے ساتھ رہتا تھا سایہ مرا
شریکِ حیات اور ساتھی مرا
مگر اِن دنوں ہم الگ ہو گئے ہیں

# ماڈل

ذَرا سی گر پیٹھ ننگی ہوتی
پھٹے ہوئے ہوتے اس کے کپڑے
بہت سے گھٹنوں کی پیاسی ہوتی
اور ایک دو دن کا فاقہ ہوتا

لبوں پہ سُوکھی ہوئی سی پپڑی
ذرا سی تم نے جو چھِیلی ہوتی
تو خُون کا ایک داغ ہوتا
تو پھر یہ تصویر بِک ہی جاتی

# اَکیلے

کِس قدر سیدھا، سہل، صاف ہے رستہ دیکھو
نہ کسی شاخ کا سایہ ہے، نہ دِیوار کی ٹیک
نہ کسی آنکھ کی آہٹ، نہ کسی چہرے کا شور
دُور تک کوئی نہیں، کوئی نہیں، کوئی نہیں

چند قدموں کے نِشاں، ہاں، کبھی ملتے ہیں کہیں
ساتھ چلتے ہیں جو کچھ دُور فقط چند قدم
اور پھر ٹوٹ کے گِر جاتے ہیں یہ کہتے ہوئے
"اپنی تنہائی لیے آپ چلو، تنہا، اکیلے
ساتھ آئے جو یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں "

کِس قدر سیدھا، سہل، صاف ہے رستہ دیکھو

# کِرچیں

ٹکڑا اک نظم کا______

دِن بھر میری سانسوں میں سَرکتا ہی رہا
لَب پہ آیا تو زباں کٹنے لگی
دانت سے پکڑا تو لَب چھلنے لگے
نہ تو پھینکا ہی گیا منہ سے، نہ نِگلا ہی گیا
کانچ کا ٹکڑا اٹک جائے حلق میں جیسے

ٹکڑا وہ نظم کا سانسوں میں سرکتا ہی رہا

# شام

وہ شب جس کو تم نے گلے سے لگا کر
مقدّس لبوں کی حسیں لوریوں میں
سُلایا تھا سینے پہ ہر روز
لمبی کہانی سُنا کر

وہ شب ______
وہ شب جس کی عادت بگاڑی تھی تم نے
وہ شب آج بستر پہ اوندھی پڑی رو رہی ہے

دِل میں ایسے ٹھہر گئے ہیں غم
جیسے جنگل میں شام کے سائے
جاتے جاتے سہم کے رُک جائیں
مُڑ کے دیکھیں اُداس راہوں پر
کیسے بجھتے ہوئے اُجالوں میں
دُور تک دُھول دُھول اُڑتی ہے

# ایک اور سُر

سُر وہی، سازوں پہ چلتی ہوئی آواز وہی
ہاں وہی رنگ ہے، مہکی ہوئی خُوشبو بھی وہی
اب بھی شاخوں پہ وہی شبنمی قَطرے قَطرے
اب بھی چلتی ہے صبا پتّوں پہ پاؤں رکھ کر
جھُک کے پانی میں تکا کرتی ہے چہرہ، لیکن

ایک سُر اور بھی ہے ____
تیری آواز سے لپٹی ہوئی خاموشی کا سُر !

# خاموشی

کھڑکیاں بند ہیں، دِیواروں کے سینے ٹھنڈے
پیٹھ پھیرے ہوئے دَروازوں کے چہرے چُپ ہیں
میز کرسی ہیں کہ خاموشی کے دَھبے جیسے
فرش میں دفن ہیں سب آہٹیں سارے دِن کی
سارے ماحول پہ تالے سے پڑے ہیں چُپ کے

تیری آواز کی اک بُوند جو مل جائے کہیں
آخری سانسوں پہ ہے رات ــــــ یہ بچ جائے گی

# تخلیق

پُورن ماشی کی رات جنگل میں
جب کبھی چاندنی برستی ہے
پتّوں میں ٹِکلیاں سی بجتی ہیں

پُورن ماشی کی رات جنگل میں
نیلے شِیشم کے پیڑ کے نیچے
بیٹھ کر تم کبھی سُنو، جانم!
چاندنی میں دُھلی ہوئی مدّھم
بھِیگی بھِیگی اُداس آوازیں
نام لے کر پُکارتی ہیں تمھیں

کِتنی صَدیوں سے ڈُھونڈتی ہوں گی
تم کو یہ چاندنی کی آوازیں

تمہارے ہونٹوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی تلاوتیں
جُھک کے میری آنکھوں کو چھو رہی ہیں
میں اپنے ہونٹوں سے چُن رہا ہوں تمہاری سانسوں کی آیتوں کو
کہ جسم کے اس حسین کعبے پہ رُوح سجدے بچھا رہی ہے

وہ ایک لمحہ بڑا مقدّس تھا جس میں تم جنم لے رہی تھیں
وہ ایک لمحہ بڑا مقدّس تھا جس میں مَیں جنم لے رہا تھا
وہ ایک لمحہ بڑا مقدّس ہے جس کو ہم جنم دے رہے ہیں

خُدا نے ایسے ہی ایک لمحے میں سوچا ہو گا
حیات تخلیق کر کے لمحے کے لمس کو جاوِداں بھی کر دے

# لَمس

قرآن ہاتھوں میں لے کے نابینا اِک نمازی
لَبوں پہ رکھتا تھا دونوں آنکھوں سے چُومتا تھا
جھکا کے پیشانی، یُوں عقیدت سے چُھو رہا تھا
جو آیتیں پڑھ نہیں سکا، اُن کا لمس محسوس کر رہا ہو
میں حیراں حیراں گُزر رہا تھا
میں حیراں حیراں ٹھہر گیا ہوں

تمہارے ہاتھوں کو چُوم کر، چُھو کے اپنی آنکھوں سے آج میں نے
جو آیتیں پڑھ نہیں سکا اُن کے لمس محسوس کر لیے ہیں

## تھکاوٹ

ستارے لٹکے ہوئے ہیں تاگوں سے آسماں پر
چمکتی چنگاریاں سی چکرا رہی ہیں آنکھوں کی پتلیوں میں
نظر سے چپکے ہوئے ہیں کچھ چکنے چکنے سے روشنی کے دھبے
جو پلکیں موندوں تو چبھنے لگتی ہیں روشنی کی سفید کرچیں

مجھے مرے مخملیں اندھیروں کی گود میں ڈال دو اُٹھا کر
چٹختی آنکھوں پہ گھپ اندھیروں کے پھاہے رکھ دو
یہ روشنی کا اُبلتا لاوا نہ اندھا کر دے!

# ثَبات

آدمی بُلبُلہ ہے پانی کا
اور پانی کی بہتی سطح پر
ٹُوٹتا بھی ہے، ڈُوبتا بھی ہے
پھر اُبھرتا ہے پھر سے بہتا ہے

نہ سمندر نِگل سکا اِس کو
نہ تواریخ توڑ پائی ہے
وقت کی موج پر سدا بہتا
آدمی بُلبُلہ ہے پانی کا

# جکڑن

اوزار کوئی
ترکیب کوئی
نہ جانے کہاں کیا اٹکا ہے
نہ جانے کہاں کیا جام ہوا
یہ رات کہ بند ہوتی ہی نہیں
یہ دن ہے کہ اُف کھلتا ہی نہیں

اوزار کوئی!
ترکیب کوئی!

# گُڈ مارننگ

کھول کر باہوں کے دو اُلجھے ہوئے سے مصرعے
ہولے سے چُوم کے دو نیند سے چھلکی پلکیں
ہونٹ سے لپٹی ہوئی زُلف کو، منّت سے ہٹا کر
کان پر دِھیمے سے رَکھ دوں گا جو آواز کے دو ہونٹ
میں جگاؤں گا تجھے نام سے "سَونا، اوئے سَونا"

اور تم دِھیرے سے جب پلکیں اُٹھاؤ گی نا، اُس دم
دُور ٹھہرے ہوئے پانی پہ سحر کھولے گی آنکھیں
صبح ہو جائے گی تب، ____ صبح زمیں پر!!

# لَو

میری گودی میں پڑا، رات کی تنہائی میں اکثر
جسم جلتا ہے ترے جسم کو چھونے کے لئے
ہاتھ اُٹھتے ہیں تری لَو کو پکڑنے کے لئے
سانسیں کھِنچ کھِنچ کے چِنچ جاتی ہیں تاگوں کیطرح
ہانپ جاتی ہے بِلکتی ہوئی باہوں کی تلاش

اور ہر بار یہی سوچا ہے تنہائی میں مَیں نے
اپنی گودی سے اُٹھا کر یہ تری گود میں رکھ دوں
رُوح کی آگ میں یہ آگ بھی شامل کر دُوں

# احساس

صِرف احساس کہ تم پاس ہو بس!
صِرف احساس کہ نزدیک ہو تم ___ !!

اَن گنت لوگوں میں گھبرائی ہوئی
اَجنبی آنکھوں سے لجّائی ہوئی
تن پہ لگتی ہیں چِپکتی آنکھیں
برف سی ٹھنڈی، سُلگتی آنکھیں

اَن ِگنت نظروں میں اُلجھا، لپٹا
اَن ِگنت چہروں میں رکھّا چہرہ
سینکڑوں تاگوں میں اُلجھائی ہوئی
سہمی سمٹی ہوئی، شرمائی ہوئی

صِرف احساس کہ پاس ہو تم!
صِرف احساس کہ نزدیک ہو بس!!

# تنہا

کہاں چھپا دی ہے رات تُو نے
کہاں چھپائے ہیں تُو نے اپنے گُلابی ہاتھوں کے ٹھنڈے پھائے
کہاں ہیں تیرے لبوں کے چہرے
کہاں ہے تو آج ___ تو کہاں ہے؟

یہ میرے بستر پہ کیسا سنّاٹا سو رہا ہے!!

# نقاب

ننگی بے باک دُھوپ میں دِن بھر
کوڑے برساتا ہوں غلاموں پر
بیچتا ہوں، خریدتا ہوں انہیں

منہ اُٹھا کر، حویلیوں کی طرف
اپنے آقاؤں کی اَنا کے لئے
خود کو نیلام کر کے ہنستا ہوں

ننگی بیباک دُھوپ میں دِن بھر
کرتا رہتا ہوں، سودے سمجھوتے
اور تنہائیوں میں پھِر، شب بھر
مُنہ چھپا کر سِسکتا رہتا ہوں

ایک بھی ہے، اَنیک بھی آدم
ایک چہرے میں کتنے چہرے ہیں

# خودی

یہ گول سکّے، دَمکتے ہوئے کھنکتے ہوئے
کسی پہ مُہرا ہوا ایک راجا کا چہرہ
کسی پہ مُہری ہوئی ایک رانی کی تصویر

ہر اک کی پُشت پہ اَوقات سب کی لکھی ہے
یہ ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے ہیں جہاں جائیں

بچا کے رکھنا تم اپنی خُودی کے چہرے کو
گِنے نہ جاؤ کہیں تم بھی کھوٹے سکّوں میں

# جنازہ

سفید بستر پہ ایک میت پڑی ہوئی ہے
جسے کہ دفنانا بھول کر لوگ چل دیئے ہیں
کہ جیسے میرا دفن کفن ان کا حصہ نہ تھا

وہ لوگ لَوٹیں
وہ دیکھیں، پہچانیں
دفن کردیں تو سانس آئے

# ایک سکیچ

سر پر چلاّتی ہوئی دُھوپ کا سُنسان پہر
اور اِک شعلہ زباں دیوِ فلک چاٹ رہا ہے
دُور اک سُوکھے ہوئے پیڑ پہ اِک چیل کا سایہ
خُشک آنکھوں سے یہ بے کیف خلا تول رہا ہے
اپنے پر تول کے
کچھ سوچ کے پھر تولتا ہے
کس طرف؟ کس کے لیے؟ کس کے لیے؟
کس کے لیے؟

# ایک اور سکیچ

گول پھُولا ہوا سُورج کا غُبارہ تھک کر
ایک نوکیلی پہاڑی پہ یوں جا کے ٹِکا ہے
جیسے انگلی پہ مداری نے اُٹھا رکھا ہو گولہ
پھُونک سے ٹھیلو تو پانی میں اُتر جائے گا

بھک سے پھٹ جائے گا پھُولا ہوا سُورج کا غُبارہ
چھَن سے بُجھ جائے گا اِک اور دہکتا ہوا دن

## پَت جھڑ

جب جب پت جھڑ میں پیڑوں سے پیلے پیلے پتّے
میرے لان میں آ کر گرتے ہیں
رات کو چھت پر جا کے میں آکاش کو تکتا رہتا ہوں

لگتا ہے کمزور سا پیلا چاند بھی شاید
پیپل کے سُوکھے پتّے سا
لہراتا لہراتا میرے لان میں آ کر اُترے گا!

# اُمید

دُھوپ کی دُھول کو جب
جھاڑ کر مَزدُور پَرندے
آشیانوں کی طرف لوٹ کے آجاتے ہیں
اور پلکوں کی طرح شام اُترتی ہے زمیں پر،
رات آتی ہے،
بُجھا دیتی ہے سب رنگوں کے چہرے
اپنے دَروازے پہ اِک لَو کا لگا دیتا ہُوں ٹیکا
تم اگر لوٹ کے آؤ تو یہ دَروازہ نہ بھُولو!

# گُزارش

میں نے رَکھی ہوئی ہیں آنکھوں پر
تیری غمگین سی اُداس آنکھیں
جیسے گِرجے میں رکھّی خاموشی
جیسے رحلوں پہ رکھّی انجیلیں

ایک آنسو گِرا دو آنکھوں سے
کوئی آیت ملے نمازی کو
کوئی حرفِ کلامِ پاک ملے

# شَرارت

آؤ تم کو اُٹھالوں کندھوں پر
تم اُچک کر شریر ہونٹوں سے
چُوم لینا یہ چاند کا ماتھا

آج کی رات دیکھا نا تُم نے،
کیسے جُھک جُھک کے کہنیوں کے بل
چاند اِتنا قریب آیا ہے!

# سَرگوشی

کُچھ ایسے آ کر، گرا ہے سوتے میں،
شاخ سے پھُول میرے چہرے پہ

جیسے ہولے سے رات تم نام لے کر مُجھ کو
جگا رہی تھیں

# پورٹریٹ

# غالبؔ

بلّی ماراں کے محلّے کی وہ پیچیدہ دلیلوں کی سی گلیاں
سامنے ٹال کی نکّڑ پہ بٹیروں کے قصیدے
چند دَروازوں پہ لٹکے ہوئے بوسیدہ سے کچھ ٹاٹ کے پردے
اور دُھندلائی ہوئی شام کے بے نُور اندھیرے سائے
ایسے دیواروں سے منہ جوڑ کے چلتے ہیں یہاں
چُوڑی والان کے کٹڑے کی بڑی بی جیسے
اپنی بجھتی ہوئی آنکھوں سے دروازے ٹٹولے

اِسی بے نُور اندھیری سی، گلی قاسم، سے
ایک ترتیب چراغوں کی شروع ہوتی ہے
ایک قرآنِ سخن کا بھی ورق کھلتا ہے
اسداللہ خاں غالبؔ کا پتہ ملتا ہے

# اَحمد ندیم قاسمی

اِک گھنا پیڑ ہے وہ جس کی گھنی چھاؤں میں
دُھوپ اُترتی ہے تو اتنی سی زمیں پر جیسے
سینکڑوں لفظوں کے سکّے سے بکھر جاتے ہیں
گول، چوکور، چمکدار، طلائی سکّے
جانے کیا لکھتی ہے چھاؤں میں پڑی دُھوپ وہاں
میں بھی اُس پیڑ کی چھاؤں میں گیا ہوں برسوں
اور بھر لیتا تھا ان سکّوں سے جیبیں اپنی
اور تنہائی کو پہلو میں بٹھا کر اکثر
پہروں آہنگ سنا کرتا تھا ان سکّوں کا

ان پہ ابھرے ہوئے چہروں کو پڑھا کرتا تھا
کوئی افسانہ سُناتا تھا، کوئی نظم کبھی

اَدب و شعر کے گلشن میں بہت ذِکر سُنا
اس کی گھنی چھاؤں کا

اب بھی جاتا ہوں میں جب اپنے سَخی پیڑ کے پاس
تو وہ بھر دیتا ہے جھب سے مری خالی جھولی
نئی نظموں، نئی غزلوں، نئے افسانوں سے
وہ سخی پیڑ مرا دوست، مرا بابا ہے
وہ جسے لوگ بڑے پیار سے کہتے ہیں ندیم

# بِمل رائے

شام کے کہرے میں بہتا ہوا خاموش ندی کا چہرہ
گندمی کہرے میں جلتے ہوئے آنکھوں کے چراغ
اک لگاتار سُلگتا ہوا سِگریٹ کا دُھواں
نیند میں ڈُوبی ہوئی دُور کی مدھم آواز

اجنبی خوابوں کے اُڑتے ہوئے سایوں کے تلے
موم کی طرح پگھلتے ہوئے چہرے کے نقوش
ہر نئے خواب کی دُھن سُن کے بدل جاتے ہیں
ایسا لگتا ہے نہ سوئے گا، نہ جاگے گا، نہ بولے گا کبھی
شام کے کہرے میں بہتا ہو خاموش ندی کا چہرہ

# سَلیل چودھری



کپکپاتی ہوئی تالاب کے پانی کی سطح
سُوت کے تاگوں سے باندھے ہوئے سیلاب کا شور
ہلکی سی ضرب سے جھنّا کے یہ بج اُٹھتے ہیں
تیز چاقو سے تراشے ہوئے چہرے کے نقوش
مضطرب چہرے پہ اُڑتے ہوئے آنکھوں کے حروف
اک تجسّس میں ہیں، لگتا ہے کسی بھی لمحے
اپنے ہی صفحے سے گھبرا کے یہ اُڑ جائیں گے

اپنے ہی آپ سے گھبرا کہ نہ چُھٹ جائے کہیں
خود سے الجھی ہوئی ایسی پرواز

# جِتن داس

ایک مصوّر،
ہاتھ اُٹھا کر،
چاند کے چاک سے پھر آکاش پہ گرم لکیریں کھینچ رہا ہے

پیلٹ کے اُوپر رکھّی ہے گرم شفق
لِپٹا تا ہے، کھولتا ہے، آکاش کا کینوس
انگلیوں سے لِپٹی ہُوئی ہے،
کُچھ نوزائیدہ جسموں کی گیلی مٹّی!

جسموں کے کُوزوں پہ جُھک کر،
سُورج کے قطرے ٹپکا کے،
چہروں کے نُسخے لکھتا ہے۔
سانسیں لیتی آنکھیں اُن کے اُوپر رکھ کے،
ڈھونڈتا ہے،
اِن چہروں میں کون سا چہرہ 'اُس کا' ہے۔

# شاعر

تُوت کی شاخ پہ بیٹھا کوئی
بُنتا ہے ریشم کے تاگے
لمحہ لمحہ کھول رہا ہے
پتّہ پتّہ بین رہا ہے
ایک ایک سانس بجا کر سُنتا ہے سودائی
اک اک سانس کو کھول کے اپنے تن پر لپٹاتا جاتا ہے

اپنی ہی سانسوں کا قیدی
ریشم کا یہ شاعر اک دن
اپنے ہی تاگوں میں گُھٹ کر مر جائے گا

# طوائف

کھیت کے سبزے میں بے سُدھ پڑی ہے دُبکی
ایک پگڈنڈی کی کچلی ہوئی ادھ موئی سی لاش
تیز قدموں کے تلے درد سے کراہتی ہے
دو کِناروں پہ جواں سِٹّوں کے چہرے تک کر
چُپ سی رہ جاتی ہے یہ سوچ کے ___ بس

یُوں مری کوکھ کُچل دیتے نہ رہگیر اگر
میرے بیٹے بھی جواں ہو گئے ہوتے اب تک
میری بیٹی بھی تو اب بیاہنے کے قابل ہوتی

# غزلیات

# غزل

بیتے رشتے تلاش کرتی ہے
خوشبو غُنچے تلاش کرتی ہے

جب گُزرتی ہے اُس گلی سے صبا
خط کے پُرزے تلاش کرتی ہے

اپنے ماضی کی جُستجُو میں بہار
پیلے پتّے تلاش کرتی ہے

ایک اُمید بار بار آ کر!
اپنے ٹکڑے تلاش کرتی ہے

بُوڑھی پگڈنڈی شہر تک آ کر
اپنے بیٹے تلاش کرتی ہے

# غزل

پیڑ کے پتّوں میں ہلچل ہے، خبردار سے ہیں
شام سے تیز ہَوا چلنے کے آثار سے ہیں

ناخُدا دیکھ رہا ہے کہ میں گرداب میں ہوں
اور جو پُل پہ کھڑے لوگ ہیں، اَخبار سے ہیں

چڑھتے سیلاب میں ساحِل نے تو منہ ڈھانپ لِیا
لوگ پانی کا کفن لینے کو تیّار سے ہیں

کل تَوارِیخ میں دفنائے گئے ہیں جو لوگ
اُن کے سائے ابھی دَروازوں پہ بیدار سے ہیں

وقت کے تیر تو سینے پہ سنبھالے ہم نے
اور جو نِیل پڑے ہیں، تری گفتار سے ہیں

رُوح سے چھیلے ہُوئے جِسم جہاں بِکتے ہیں
ہم کو بھی بیچ دے، ہم بھی اسی بازار سے ہیں

جب سے وہ اہلِ سیاست میں ہُوئے ہیں شامل
کچھ عدو کے ہیں تو کچھ میرے طرف دار سے ہیں

# غزل

پھُول نے ٹہنی سے اُڑنے کی کوشش کی
اِک طائر کا دِل رکھنے کی کوشش کی

کل پھر چاند کا خنجر گھونپ کے سینے میں
رات نے میری جاں لینے کی کوشش کی

کوئی نہ کوئی رَہبر رَستہ کاٹ گیا
جب بھی اپنی رہ چلنے کی کوشش کی

کتنی لمبی خاموشی سے گُزرا ہوں
اُن سے کتنا کُچھ کہنے کی کوشش کی

ایک ہی خواب نے سَاری رات جگایا ہے
میں نے ہر کَروٹ سونے کی کوشش کی

ایک سِتارہ جلدی جلدی ڈوب گیا
میں نے جب تارے گِننے کی کوشش کی

نام مرا تھا اور پتہ اپنے گھر کا
اُس نے مجھ کو خط لکھنے کی کوشش کی

ایک دُھوئیں کا مرغولہ سا نِکلا ہے
مٹّی میں جب دِل بونے کی کوشش کی

# غزل

کھُلی کتاب کے صفحے اُلٹتے رہتے ہیں
ہَوا چلے نہ چلے، دِن پلٹتے رہتے ہیں

بس ایک وحشتِ منزل ہے اور کچھ بھی نہیں
کہ چند سیڑھیاں چڑھتے اُترتے رہتے ہیں

مجھے تو روز کسوٹی پہ دَرد کستا ہے
کہ جاں سے جسم کے بخیے اُدھڑتے رہتے ہیں

کبھی رُکا نہیں کوئی مقام صحرا میں
کہ ٹیلے پاؤں تلے سے سَرکتے رہتے ہیں

یہ روٹیاں ہیں، یہ سکّے ہیں اور دائرے ہیں
یہ ایک دوجے کو دِن بھر پکڑتے رہتے ہیں

بکھرے ہیں رات کے ریزے کچھ ایسے آنکھوں میں
اُجالا ہو تو ہم آنکھیں جھُپکتے رہتے ہیں

# غزل

ہم تو کتنوں کو مہ جبیں کہتے
آپ ہیں اس لیے نہیں کہتے

چاند ہوتا نہ آسماں پہ اگر
ہم کسے آپ سا حسیں کہتے

آپ کے پاؤں پھر کہاں پڑتے
ہم زمیں کو اگر زمیں کہتے

آپ نے اوروں سے کہا سب کچھ
ہم سے بھی کچھ، کبھی، کہیں کہتے

آپ کے بعد، آپ ہی کہیئے
وقت کو کیسے ہم نشیں کہتے

وہ بھی وَاحد ہے میں بھی واحد ہوں
کِس سبب سے ہم آفریں کہتے

# غزل

تجھ کو دیکھا ہے جو دریا نے ادھر آتے ہوئے
کچھ بھنور ڈوب گئے پانی میں چکراتے ہوئے

ہم نے تو رات کو دانتوں سے پکڑ کر رکھّا
چھینا جھپٹی میں اُفق کھُلتا گیا جاتے ہوئے

میں نہ ہوں گا تو خزاں کیسے کٹے گی تیری
شوخ پتّے نے کہا شاخ سے مُرجھاتے ہوئے

حسرتیں اپنی بِلکتیں نہ یتیموں کی طرح
ہم کو آواز ہی دے لیتے ذَرا، جاتے ہوئے

سی لئے ہونٹ وہ پاکیزہ نِگاہیں سُن کر
میلی ہو جاتی ہے آواز بھی، دہراتے ہوئے

# غزل

جب بھی یہ دِل اُداس ہوتا ہے
جانے کون آس پاس ہوتا ہے

آنکھیں پہچانتی ہیں آنکھوں کو
دَرد چہرہ شناس ہوتا ہے

گو برستی نہیں سَدا آنکھیں!
اَبر تو بارہ ماس ہوتا ہے

چھال پیڑوں کی سَخت ہے لیکن
نیچے ناخُن کے ماس ہوتا ہے

زخم، کہتے ہیں دِل کا گہنا ہے
دَرد دِل کا لِباس ہوتا ہے

ڈس ہی لیتا ہے سب کو عشق کبھی
سانپ موقع شناس ہوتا ہے

صِرف اُتنا کرم کیا کیجئے
آپ کو جتنا راس ہوتا ہے

# غزل

ذکر جہلم کا ہے، بات ہے دینے کی
چاند پُکھراج کا، رات پشمینے کی

کیسے اَوڑھے گی اُدھڑی ہوئی چاندنی
رات کوشش میں ہے چاند کو سینے کی

کوئی ایسا گِرا ہے نظر سے کہ بس
ہم نے صُورت نہ دیکھی پھر آئینے کی

دَرد میں جاودانی کا احساس تھا
ہم نے لاڈوں سے پالی خَلِش سینے کی

موت آتی ہے ہر رَوز ہی رُوبرو
زِندگی نے قسم دِی ہے کل جینے کی

# غزل

دکھائی دیتے ہیں، دھند میں جیسے سائے کوئی
مگر بُلانے سے وقت لوٹے نہ آئے کوئی

مرے محلّے کا آسماں سُونا ہو گیا ہے
بلندیوں پہ اَب آ کے پیچے لڑائے کوئی

وہ زرد پتّے جو پیڑ سے ٹُوٹ کر گِرے تھے
کہاں گئے بہتے پانیوں میں، بُلائے کوئی

ضَعیف برگد کے ہاتھ میں رعشہ آ گیا ہے
جٹائیں آنکھوں پہ گِر رہی ہیں، اُٹھائے کوئی

مَزار پہ کھول کر گریباں، دُعائیں مانگیں
جو آئے اب کے، تو لوٹ کر پھر نہ جائے کوئی

# غزل

ہر ایک غم نچوڑ کے، ہر ایک رَس جیئے
دو دِن کی زِندگی میں ہزاروں بَرس جیئے

صَدیوں پہ اختیار نہیں تھا ہمارا دوست
دو چار لمحے بس میں تھے، دو چار بس جیئے

صحرا کے اُس طرف سے گئے سارے کارواں
سُن سُن کے ہم تو صرف صدائے جرس جیئے

ہونٹوں میں لے کے رات کے آنچل کا اِک سرا
آنکھوں پہ رکھ کے چاند کے ہونٹوں کا مس جیئے

مَحدُود ہیں دُعائیں مرے اختیار میں
ہر سانس پُرسکون ہو، تُو سو برس جیئے

# غزل

سہما سہما ڈرا سا رہتا ہے
جانے کیوں جی بھرا سا رہتا ہے

کائی سی جم گئی ہے آنکھوں پر
سارا منظر ہرا سا رہتا ہے

ایک پل دیکھ لوں تو اُٹھتا ہوں
جل گیا گھر، ذرا سا رہتا ہے

سر میں جنبشِ خیال کی بھی نہیں
زانوؤں پر دھرا سا رہتا ہے

# غزل

خُوشبُو جیسے لوگ مِلے اَفسانے میں
ایک پُرانا خط کھولا انجانے میں

شام کے سائے بالِشتوں سے ناپے ہیں
چاند نے کتنی دیر لگا دی آنے میں

رات گُزرتے شاید تھوڑا وقت لگے
دُھوپ انڈیلو تھوڑی سی پیمانے میں

جانے کِس کا ذِکر ہے اس افسانے میں
دَرد مزے لیتا ہے جو دہرانے میں

دِل پر دستک دینے کون آ نکلا ہے
کس کی آہٹ سُنتا ہوں وِیرانے میں

ہم اِس موڑ سے اُٹھ کر اگلے موڑ چلے
اُن کو شاید عُمر لگے گی آنے میں

# غزل

زِندگی یوں ہوئی بَسر تنہا
قافلہ ساتھ اور سفر تنہا

اپنے سائے سے چونک جاتے ہیں
عُمر گُزری ہے اِس قدر تنہا

رات بھر باتیں کرتے ہیں تارے
رات کاٹے کوئی کِدھر تنہا

ڈوبنے والے پار جا اُترے
نقشِ پا اپنے چھوڑ کر تنہا

دِن گُزرتا نہیں ہے لوگوں میں
رات ہوتی نہیں بَسر تنہَا

ہم نے دَروازے تک تو دیکھا تھا
پھر نہ جانے گئے کِدھر تنہَا

# غزل

دِن کُچھ ایسے گُزارتا ہے کوئی
جیسے احساں اُتارتا ہے کوئی

دِل میں کُچھ یوں سنبھالتا ہوں غم
جیسے زیور سنبھالتا ہے کوئی

آئنہ دیکھ کر تسلّی ہوئی
ہم کو اِس گھر میں جانتا ہے کوئی

پیڑ پر پک گیا ہے پھَل شاید
پھر سے پتّھر اُچھالتا ہے کوئی

دیر سے گُونجتے ہیں سنّاٹے
جیسے ہم کو پُکارتا ہے کوئی

# غزل

ہوا کے سِینگ نہ پکڑو، کھدیڑ دیتی ہے
زمیں سے پیڑوں کے ٹانکے اُدھیڑ دیتی ہے

میں چُپ کراتا ہوں ہر شب اُمڈتی بارش کو
مگر یہ روز گئی بات چھیڑ دیتی ہے

زمیں سا دُوسرا کوئی سَخی کہاں ہو گا
ذرا سا بیج اُٹھا لے تو پیڑ دیتی ہے

رُندھے گلے کی دعاؤں سے بھی نہیں کھُلتا
درِ حیات، جِسے موت بھیڑ دیتی ہے

# غزل

جب بھی آنکھوں میں اشک بھر آئے
لوگ کُچھ ڈُوبتے نظر آئے

اپنا مَحور بدل چُکی تھی زَمیں
ہم خلا سے جو لوٹ کر آئے

چاند جِتنے بھی گُم ہوئے شب کے
سب کے اِلزام میرے سر آئے

چند لمحے جو لوٹ کر آئے
رات کے آخری پہر آئے

ایک گولی گئی تھی سُوئے فلک
اِک پرندے کے بال و پر آئے

کچھ چراغوں کی سانس ٹوٹ گئی
کچھ بمشکل دمِ سحر آئے

مجھ کو اپنا پتہ ٹھکانہ ملے
وہ بھی اِک بار میرے گھر آئے

# غزل

ذِکر آئے تو مرے لَب سے دعائیں نکلیں
شمع جلتی ہے تو لازم ہے شعائیں نکلیں

وقت کی ضرب سے کٹ جاتے ہیں سب کے سینے
چاند کا چھِلکا اُتر جائے تو قاشیں نکلیں

دفن ہو جائیں کہ زَرخیز زَمیں لگتی ہے
کل اِسی مٹّی سے شاید مری شاخیں نکلیں

چند اُمیدیں نچوڑی تھیں تو آہیں ٹپکیں
دل کو پگھلائیں تو ہو سکتا ہے سانسیں نکلیں

غار کے منہ پہ رَکھا رہنے دو سنگِ خورشید
غار میں ہاتھ نہ ڈالو کہیں راتیں نکلیں

# غزل

اَوس پڑی تھی رات بہت، اور کہرہ تھا گرمائش پر
سیلی سی خاموشی میں، آواز سُنی فرمائش پر

فاصلے ہیں بھی اور نہیں بھی، ناپا تولا کچھ بھی نہیں
لوگ بضد رہتے ہیں پھر بھی رِشتوں کی پیمائش پر

منہ موڑا اور دیکھا کتنی دُور کھڑے تھے ہم دونوں
آپ لڑے تھے ہم سے بس اِک کروٹ کی گنجائش پر

کاغذ کا اِک چاند لگا کر، رات اَندھیری کھڑکی پر
دل میں کتنے خوش تھے اپنی فرقت کی آرائش پر

دل کا حجرہ کِتنی بار اُجڑا بھی اور بسایا بھی
ساری عُمر کہاں ٹھہرا ہے، کوئی ایک رہائش پر

دُھوپ اور چھاؤں بانٹ کے تم نے آنگن میں دیوار چُنی
کیا اِتنا آسان ہے زندہ رہنا اِس آسائش پر

شاید تین نجومی میری موت پہ آ کر پہنچیں گے
ایسا ہی اِک بار ہوا تھا عیسٰی کی پیدائش پر

# غزل

ذکر ہوتا ہے جہاں بھی مرے افسانے کا
ایک دروازہ سا کھلتا ہے کتب خانے کا

ایک سنّاٹا دَبے پاؤں گیا ہو جیسے
دل سے اِک خوف سا گزرا ہے بچھڑ جانے کا

بُلبُلہ پھر سے چلا پانی میں غوطے کھانے
نہ سمجھنے کا اسے وقت نہ سمجھانے کا

میں نے الفاظ تو بیجوں کی طرح چھانٹ دیئے
ایسا میٹھا ترا انداز تھا فرمانے کا

کس کو رَوکے کوئی رستے میں کہاں بات کرے
نہ تو آنے کی خبر ہے، نہ پَتہ جانے کا

# غزل

وہ خط کے پُرزے اُڑا رہا تھا
ہواؤں کا رُخ دِکھا رہا تھا

بتاؤں کیسے وہ بہتا دریا
جب آ رہا تھا تو جا رہا تھا

کچھ اور بھی ہو گیا نمایاں
میں اپنا لِکّھا مِٹا رہا تھا

دُھواں دُھواں ہو گئی تھیں آنکھیں
چراغ کو جب بجھا رہا تھا

منڈیر سے جھک کے چاند کل بھی
پڑوسیوں کو جگا رہا تھا

اُسی کا اِیماں بدل گیا ہے
کبھی جو میرا خُدا رہا تھا

وہ ایک دن ایک اَجنبی کو
مری کہانی سُنا رہا تھا

وہ عُمر کم کر رہا تھا میری
میں سال اپنے بڑھا رہا تھا

خدا کی شاید رَضا ہو اس میں
تمہارا جو فیصلہ رہا تھا

# غزل

رات نے راج پاٹ تیاگا نہیں
آلسی آفتاب جاگا نہیں

بند کر لو کواڑ آنگن کے
اب تو آکاش میں بھی کاگا نہیں

سامنے ہی سے آیا تھا سُورج
چاند پچھواڑے سے تو بھاگا نہیں

خالی کَرگھے میں عُمر بنتا رہا
اب گرہ کے لیے بھی دَھاگا نہیں

# غزل

ایسا خاموش تو منظر نہ فنا کا ہوتا
میری تصویر بھی گرتی تو چھناکا ہوتا

یوں بھی اک بار تو ہوتا کہ سمندر بجتا
کوئی احساس تو دریا کی اَنا کا ہوتا

سانس مَوسم کی بھی کُچھ دیر کو چلنے لگتی
کوئی جھونکا تری پلکوں کی ہوا کا ہوتا

کانچ کے پار ترے ہاتھ نظر آتے ہیں
کاش خُوشبُو کی طرح رنگ حِنا کا ہوتا

کیوں مری شکل پہن لیتا ہے چھُپنے کیلئے
ایک چہرہ، کوئی اپنا بھی خدا کا ہوتا

# غزل

کوئی اٹکا ہوا ہے پَل شاید
وقت میں پڑ گیا ہے بَل شاید

لَب پہ آئی مری غزل شاید
وہ اکیلے ہیں آج کل شاید

دِل اگر ہے تو دَرد بھی ہو گا
اس کا کوئی نہیں ہے حل شاید

جانتے ہیں ثوابِ رحم و کرم
اُن سے ہوتا نہیں عمل شاید

آ رہی ہے جو چاپ قدموں کی
کھِل رہے ہیں کہیں کنول شاید

راکھ کو بھی کرید کر دیکھو
ابھی جلتا ہو کوئی پَل شاید

چاند ڈُوبے تو چاند ہی نکلے
آپ کے پاس ہو گا حل شاید

# غزل

ہاتھ چُھوٹیں بھی تو رِشتے نہیں چھوڑا کرتے
وقت کی شاخ سے لمحے نہیں توڑا کرتے

جس کی آواز میں سِلوٹ ہو، نگاہوں میں شِکن
ایسی تصویر کے ٹکڑے نہیں جوڑا کرتے

لگ کے ساحل سے جو بہتا ہے اُسے بہنے دو
ایسے دریا کا کبھی رخ نہیں موڑا کرتے

جاگنے پر بھی نہیں آنکھ سے گرتیں کرچیں
اِس طرح خوابوں سے آنکھیں نہیں پھوڑا کرتے

شہد جینے کا ملا کرتا ہے تھوڑا تھوڑا
جانے والوں کے لیے دِل نہیں تھوڑا کرتے

جا کے کہسار سے سَر مارو کہ آواز تو ہو
خستہ دِیواروں سے ماتھا نہیں پھوڑا کرتے

# غزل

ہاں مرے غم تو اُٹھا لیتا ہے، غم خوار نہیں
دِل پڑوسی ہے مگر میرا طرف دار نہیں

جانے والوں کو کہاں روک سکا ہے کوئی
گھر میں دروازہ تو ہے، پیچھے کی دیوار نہیں

آپ کے بعد یہ محسوس ہُوا ہے ہم کو
جینا مشکل نہیں اور مرنا بھی دُشوار نہیں

کانچ کے گھر ہیں یہاں سَب کے، بس اِتنا سوچیں
عَرض کرتے ہیں فقط، آپ سے تکرار نہیں

# غزل

شام سے آنکھ میں نَمی سی ہے
آج پھر آپ کی کمی سی ہے

دفن کر دو ہمیں کہ سانس آئے
نَبض کُچھ دیر سے تھمی سی ہے

کون پتھرا گیا ہے آنکھوں میں
بَرف پلکوں پہ کیوں جمی سی ہے

وقت رہتا نہیں کہیں ٹِک کر
عادت اس کی بھی آدمی سی ہے

آیئے راستے الگ کر لیں
یہ ضَرورت بھی باہمی سی ہے

# غزل

صبر ہر بار اختیار کیا
ہم سے ہوتا نہیں ہزار کیا

عادتاً تُم نے کر دیئے وعدے
عادتاً ہم نے اعتبار کیا

ہم نے اکثر تمہاری راہوں میں
رُک کے اپنا ہی اِنتظار کیا

پھر نہ مانگیں گے زِندگی یا رب
یہ گُنہ ہم نے ایک بار کیا

# غزل

رُکے رُکے سے قدم رُک کے بار بار چلے
قرار دے کے ترے دَر سے بے قرار چلے

اُٹھائے پھرتے تھے احسان جسم کا جاں پر
چلے جہاں سے تو یہ پیرہن اُتار چلے

نہ جانے کون سی مٹّی وطن کی مٹّی تھی
نظر میں 'دُھول' جگر میں لیے غُبار چلے

سحر نہ آئی کئی بار نیند سے جاگے
تھی رات رات کی یہ زِندگی گُزار چلے

مِلی ہے شمع سے یہ رسمِ عاشقی ہم کو
گناہ ہاتھ پہ لے کر گناہ گار چلے

# غزل

شام سے آج سانس بھاری ہے
بے قراری سی بے قراری ہے

آپ کے بعد ہر گھڑی ہم نے
آپ کے ساتھ ہی گزاری ہے

رات کو دے دو چاندنی کی رِدا
دِن کی چادر ابھی اُتاری ہے

شاخ پر کوئی قہقہہ تو کھِلے
کیسی چُپ سی چمن میں طاری ہے

کل کا ہر واقعہ تمھارا تھا
آج کی داستاں ہماری ہے

# غزل

سارے ہم شکل سے کھڑے ہیں یہاں
آئینے آئینے، جڑے ہیں یہاں

جَھونکا آئے تو کوئی جُنبش ہو!!
سوکھے پتّوں سے سب پڑے ہیں یہاں

میری نادانیوں پہ مت جانا
پُوچھ لو اُن سے جو بڑے ہیں یہاں

شہر کھودا تو پیاس نِکلی ہے
ٹُوٹے پھُوٹے سے کُچھ گھڑے ہیں یہاں

# غزل

کوہ پر آسمان کھُلتا ہے
جیسے کپڑے کا تھان کھُلتا ہے

کھٹکھٹاتا ہوں ایک ایک دَر کو
دیکھیے کب مکان کھُلتا ہے

بہہ چلی ہے زَمین کی کشتی
صبح کا بادبان کھُلتا ہے

لوگ آئینوں جیسے لگتے ہیں
راز جب میری جان کھُلتا ہے

# غزل

کوئی خاموش زخم لگتی ہے
زِندگی ایک نظم لگتی ہے

بزمِ یاراں میں رہتا ہوں تنہا
اور تنہائی بزم لگتی ہے

اپنے سائے پہ پاؤں رَکھتا ہوں
چھاؤں چھالوں کو نرم لگتی ہے

چاند کی نبض دیکھنا اُٹھ کر
رات کی سانس گرم لگتی ہے

یہ رَوایت کہ درد مہکے رہیں
دل کی دیرینہ رسم لگتی ہے

# غزل

بے سبب مُسکرا رہا ہے چاند
کوئی سازش چُھپا رہا ہے چاند

جانے کِس کی گلی سے نکلا ہے
جھیپا جھینپا سا آ رہا ہے چاند

کتنا غازہ لگتا ہے منہ پر
دُھول ہی دُھول اُڑا رہا ہے چاند

کیسا بیٹھا ہے چُھپ کے پتّوں میں
باغباں کو ستا رہا ہے چاند

سیدھا سادا اُفق سے نکلا تھا
سر پہ اب چڑھتا جا رہا ہے چاند

چُھو کے دیکھا تو گرم تھا ماتھا
دُھوپ میں کھیلتا رہا ہے چاند

# غزل

جسم سے جان، سخت ہے بھائی
ایک پل، پُورا وقت ہے بھائی

آ کے ہم آستاں پہ بیٹھ گئے
چل چلاؤ کا وقت ہے بھائی

نکہتِ گل کو ہم سے کیا لینا
اپنی مَستی میں مَست ہے بھائی

آنکھ اور دل جُدا جُدا تو نہیں
مُستقل بندوبست ہے بھائی

چھیڑ خانی نہ کر جوانی سے
سخت فِتنہ پرست ہے بھائی

آدمی خُود ہی دَوڑے جاتا ہے
خود ہی چابک بدست ہے بھائی

اک گھنی چھاؤں پی رہا ہوں میں
کتنا ٹھنڈا درخت ہے بھائی

# غزل

مُجھے اندھیرے میں بیشک بٹھا دیا ہوتا
مگر چراغ کی صُورت جَلا دیا ہوتا

نہ روشنی کوئی آتی مرے تعاقب میں
جو اپنے آپ کو میں نے بُجھا دیا ہوتا

بہت شدید تھے یا رب مرے وجود کے زخم
مجھے صَلیب پہ دَو پل سُلا دیا ہوتا

ہر ایک سمت تشدّد ہے، بَربریت ہے
کبھی تو اس پہ بھی پَردہ گِرا دیا ہوتا

یہ شُکر ہے کہ مرے پاس تیرا غم تو رہا
وگرنہ زندگی بھر کو رُلا دیا ہوتا

# ترائیلے، ترو ینی

# ترائیلے

کہنی ٹیک کے کھڑکی پر، کل چاند جب آ کر بیٹھا تھا
تیری باتیں کرتے کرتے کِتنی جلدی رات گئی
شاید تیرا ذِکر تھا جو یُوں کان لگا کر بیٹھا تھا
کہنی ٹیک کے کِھڑکی پر، کل چاند جب آ کر بیٹھا تھا

ہونٹوں سے کُچھ ایسے تیرا نام اَدا کر بیٹھا تھا
چاند نے آہ بھری، میں سمجھا، اَب تاروں تک بات گئی
کہنی ٹیک کے کِھڑکی پر، کل چاند جب آ کر بیٹھا تھا
تیری باتیں کرتے کرتے، کِتنی جلدی رات گئی

# ترائیلے

دردِ کچھ ایسے ٹھہر جاتا ہے دِل میں آ کر
سُر لگاتے ہی ٹھہر جائے گویّا جیسے
آنکھ لگ جائے مُسافر کی سفر میں پل بھر
دَرد کچھ ایسے ٹھہر جاتا ہے دِل میں آ کر

زِندگی بھر کے جَھمیلوں سے گُزر کر آخر
ایک سمجھوتے کا مِل جائے رویّہ جیسے
دردِ کچھ ایسے ٹھہر جاتا ہے دِل میں آ کر
سُر لگاتے ہی ٹھہر جائے گویّا جیسے

# تروینی

ہاتھ مِلا کر دیکھا، اور کُچھ سوچ کے میرا نام لِیا
جیسے یہ سَر ورق کِسی ناول پر پہلے دیکھا ہے

رِشتے کُچھ بس بند کتابوں میں ہی اچھّے لگتے ہیں

# تروینی

سامنے آئے مرے، دیکھا مُجھے، بات بھی کی
مُسکرائے بھی پُرانی کِسی پہچان کی خاطر!

کل کا اَخبار تھا، بس دیکھ لِیا، رَکھ بھی دِیا

# تروینی

شعلہ سا گذرتا ہے مِرے جِسم سے ہو کر
کِس لَو سے اُتارا ہے، خُداوِند نے تُم کو!

تِنکوں کا مِرا گھر ہے، کبھی آؤ تو کیا ہو؟

# تروینی

کوئی چادر کی طرح کھینچے چلا جاتا ہے دریا
کون سویا ہے تلے اس کے جسے ڈھونڈ رہے ہیں

ڈوبنے والے کو بھی چین سے سونے نہیں دیتے!

# تروینی

اُڑ کے جاتے ہُوئے پنچھی نے بس اتنا دیکھا
دیر تک ہاتھ ہلاتی رہی شاخ فضا میں

اَلوداع کہنے کو؟ یا پاس بُلانے کے لیے؟

# تروینی

سب پہ آتی ہے سب کی باری سے
مَوت اِنصاف کی علامت ہے

زِندگی سب پہ کیوں نہیں آتی

# تروینی

خیال پھینکا ہے رفتارِ بے پناہ کے ساتھ
خدا کو پہنچے کہ اُس سے پَرے نِکل جائے

کہ اُس کے بعد جو پہنچا تو مُجھ تک آئے گا

# تروینی

کیا پتہ کِتنی بار مارے گی
میں تو بس زِندگی سے ڈرتا ہوں

موت تو ایک بار مارے گی

# تروینی

رات کے پیڑ پہ کل ہی تو اُسے دیکھا تھا
چاند بس گرنے ہی والا تھا پکے پھل کی طرح

سُورج آیا ہے، ذرا اُس کی تلاشی لینا

# تروینی

بھیگا بھیگا سا کیوں ہے یہ اَخبار
اپنے ہاکر کو کل سے چینج کرو

'پانچ سو گاؤں بہہ گئے اِس سال'

# تروینی

شام گُزری ہے بہت پاس سے ہو کر لیکن
سَر پہ منڈلاتی ہوئی رات سے جی ڈرتا ہے

سَر چڑھے دِن کی اِسی بات سے جی ڈرتا ہے

## تروینی

زُلف میں یُوں چمک رہی ہے بُوند
جیسے بیری میں تنہا اک جگنُو

کیا بُرا ہے جو چھت ٹپکتی ہے

# تروینی

نہ ہر سحر کا وہ جھگڑا نہ شب کی بے چینی
نہ چولہا جلتا ہے گھر میں، نہ آنکھیں جلتی ہیں

میں کتنے امن سے گھر میں اُداس رہتا ہوں

# تروینی

ہم کو غالبؔ نے یہ دُعا دی تھی
تم سَلامت رہو ہزار برس

یہ برس تو فقط دِنوں میں گیا

# پہچان

# کلیات

| | |
|---|---|
| کلیاتِ امیر مینائی (مرآۃ الغیب) | امیر مینائی |
| کلیاتِ میراجی | ڈاکٹر جمیل جالبی |
| کلیاتِ سودا | مرزا محمد رفیع سودا |
| کلیاتِ فانؔی | شوکت علی خاں فانؔی |
| کلیاتِ مومنؔ | حکیم مومن خاں مومن |
| کلیاتِ آتش | حیدر علی آتش |
| کلیاتِ ظفر: ابوالظفر سراج الدّین بہادر شاہ (مکمل چار جلد) | بہادر شاہ ظفر |
| کلیاتِ میر | میر تقی میر |
| کلیاتِ اقبال: بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم، ارمغانِ حجاز | ڈاکٹر محمد اقبال |
| کلیاتِ شکیب جلالی | شکیب جلالی |
| کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی | خان بہادر سید اکبر حسین |
| کلیاتِ شہریار: اسمِ اعظم، ساتواں در، ہجر کے موسم... | شہریار |
| کلیاتِ اختر حسین جعفری: جہاں دریا اُترتا ہے، آئینہ خانہ | اختر حسین جعفری |
| کلیاتِ احمد مشتاق | احمد مشتاق |
| کلیات، دشتِ قیس میں لیلیٰ | کشور ناہید |
| رنگ-خوشبو-روشنی (کلیاتِ گیت) | قتیل شفائی |
| رنگ-خوشبو-روشنی (کلیات غزلیں) | قتیل شفائی |
| رنگ-خوشبو-روشنی (کلیات نظمیں) | قتیل شفائی |
| ندیم کی نظمیں | احمد ندیم قاسمی |
| ندیم کی غزلیں | احمد ندیم قاسمی |

The Art and Achievement of **GULZAR** Dr. Zafar Hassan

**Rs. 400.00**

www.sang-e-meel.com

ISBN-10: 969-35-2275-3
ISBN-13: 978-969-35-2275-4
9 789693 522754
www.sang-e-meel.net